ٹیگور اور اقبالؒ

ڈاکٹر عارف بٹالوی

ناشران:-
ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور

قیمت:۔ تین روپے

تعداد ۔۔۔۔۔۔ ۳۰۰۰

دسمبر ۱۹۵۱ء

ناشر ۔۔۔۔۔۔ ملک محمد عارف

مطبوعہ ۔۔۔۔۔۔ دین محمدی پریس لاہور

ٹیگور اور اقبال

حیاتِ ٹیگور

گُلِ نو

ہندوستان کی سرزمین نے ٹیگور کو اپنی گود میں جنم دے کر ہندوستان کو ادبی ممالک کی صف میں کھڑا کر دیا یہ پھول ۴ مئی ۱۸۶۱ء کو دیوندر ناتھ ٹیگور کے چمن میں کھلا۔ دیوندر ناتھ صوبہ بنگال کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ بڑے لائق اور تعلیم یافتہ تھے۔ آپ مسلمانوں کے علمی تاثرات کے سائے میں رہ کر فارسی زبان پر خاصی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی طبیعت فطری طور پر رہبانیت کی طرف زیادہ متوجہ تھی۔ چنانچہ آخری عمر میں آپ ہمالیہ کے پہاڑوں میں چلے گئے اور عبادت میں وقت گزارتے رہے۔ اسی وجہ سے رابندر ناتھ ٹیگور صرف اپنی والدہ کے دامنِ تربیت میں پرورش پاتے رہے لیکن قدرت نے بہت جلد اس درس گاہ کے دروازے بند کر دیئے اور بچپن ہی میں انہیں ماں کی آغوش سے الگ کر دیا گیا۔ انہیں ماں کے انتقال پر بے حد صدمہ پہنچا۔ اور اس کے اثر سے ٹیگور زیادہ وقت تنہائی میں گزارنے لگے۔ ایک تو انہیں گھر سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ دوسرے خود طبیعت خلوت پسند تھی۔ اس لئے دوسروں سے میل ملاپ پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا مکان تین منزلہ تھا۔ صحن کشادہ تھا اور اس میں ایک خوشنما باغیچہ تھا۔ ٹیگور جب کبھی اُداس ہوتے یا تھکن محسوس کرتے تو اس باغیچہ میں فطرت کے مطالعہ سے اپنی ذہنی

کو وقت کو ختم کر آتے تھے۔ اُن دنوں ہی باغیچہ اُن کا دوست تھا۔۔۔ ایک مرتبہ کلکتہ میں وبا پھیلی تو ٹیگور کے گھر والے گھر سے نکل کر جنگل میں گنگا کنارے چلے گئے ٹیگور بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ پہلا دن تھا کہ ٹیگور گھر سے باہر گئے تھے۔

پہلی درس گاہ

ایک دن گھر میں سے ٹیگور کے بھائی بہن سکول جانے لگے تو انہیں بھی شوق چرایا اور اس معصوم طالب علم نے سکول جانے کے لئے ضد کی سب لوگوں نے سمجھایا کہ ذرا بڑے ہو جاؤ تو تمہیں بھی مدرسہ میں داخل کر دیا جائے گا مگر طالب علم نے ایک نہ مانی اور سُنی اَن سنی کر دی اور رونے لگ گیا۔ آخر انہیں اورینٹل سیمزی بھیج دیا گیا اس مدرسہ میں وُہ زیادہ دن نہ رہ سکے اس کے بعد انہیں نارمل سکول بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی اُن کی طبیعت نہ لگ سکی۔ کیونکہ اس مدرسہ کے اُستاد اس قابل نہ تھے کہ طلباء کے ذہنی رجحان اور فطری قابلیت کا اندازہ کر سکتے۔ سکول کے دوسرے طالب علم بھی اچھے خصائل کے نہیں تھے یہی وجہ تھی کہ ٹیگور کو زمانہ تعلیم میں کوئی دوست نہ مل سکا۔ اس ماحول نے سکول کی طرف سے ٹیگور کے دل میں ایک گونہ نفرت پیدا کر دی۔ جب آپ کے والد بزرگوار کو علم ہوا تو انہوں نے کم دانش والدین کی طرح ٹیگور کو ڈانٹا نہیں بلکہ سکول سے اٹھا کر گھر بٹھا لیا اور گھر میں اُن کی ابتدائی تعلیم کا عمدہ انتظام کر دیا۔ یہ اُستاد انہیں بنگالی پڑھاتے تھے۔ مدرسے کی طرح یہاں نصاب کا کیڑا بننا ضروری نہیں تھا۔ ع کتاب خوب اں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں" کے نظریے نے ٹیگور کی تعلیم و تربیت کی آزاد راہ کھول دی۔ اس درس گاہ میں وُہ اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے لگے۔ چونکہ شعر و شاعری کی طرف فطری لگاؤ تھا اس لئے بنگال کے بڑے بڑے شعراء کا کلام اور عمدہ ادیبوں کے ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں میں ہی ٹیگور نے بنگالی زبان پر قابو پالیا۔

طلوعِ سخن

ٹیگور نے اوائل عمر میں ہی ادیبوں اور شاعروں کے ادبی خزانوں کی دولت کو حاصل کر لیا تھا۔ اور یہ دولت

دماغ کے خزانوں میں جمع کرلی گئی تھی۔ آٹھ برس کے بچہ نے ایک نظم کہی اور اس کا عنوان کنول تجویز کیا۔ ان کے بڑے بھائی نے اپنے حلقے میں اس نظم کا چرچا کیا۔ آہستہ آہستہ یہ خبر عام ہوگئی۔ جب مشفق باپ کو علم ہوا تو ہونہار بیٹے سے نظم سنی نظم پاکیزہ تھی باپ نے حوصلہ افزائی کے طور پر ننھے شاعر کو انعام عطا فرمایا۔ گھر کی حوصلہ افزائی بچوں کے لیے میدان پیدا کرتی ہے۔ اب ٹیگور کی ہمت بندھی۔ حوصلہ بڑھا اور حصولِ علم کی طرف منہمک ہوئے۔

معراجِ سفر

اِن دنوں ٹیگور کی عمر گیارہ برس کی تھی کہ دیوندر ناتھ ٹیگور گھر آئے۔ باپ نے ہونہار بیٹے میں قدرتی خوبیاں دیکھیں اور ارادہ کیا کہ اس مرتبہ اُسے بھی اپنے ساتھ زمین کی پستی سے ہمالیہ کی بلندی پر لے جاؤں گا۔ چنانچہ جب وہ ہمالیہ کے لئے تیار ہوئے تو ٹیگور کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب وہ امرتسر پہنچے تو ایک مہینہ کے لئے یہاں ٹھہر گئے۔ کیونکہ دیوندر ناتھ اُس وقت ایک رشی بن گئے تھے۔ مندروں میں جاکر عبادت کرنا اُن کا شیوہ تھا۔ امرتسر کا سنہری مندر انہیں بہت پسند آیا اور مسلسل ایک مہینہ تک وہ اس مندر میں جاتے رہے۔ ٹیگور بھی اُس رشی کے ہمراہ تھا۔ اُن کا ذہن بھی باپ کے ورثہ سے خالی نہ تھا۔ ٹیگور کا خاندان گانے بجانے میں کافی شہرت حاصل کرچکا تھا۔ ٹیگور بھی گویا بن گیا تھا۔ چنانچہ ٹیگور بھی مندر کے بھجن گانے والوں میں شریک ہوجاتے اور سریلی آواز میں گیت گاتے۔ بہار کا موسم شروع ہوا۔ تو وہ باپ بیٹا اس فضا سے نکل کر ہمالیہ کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ راستہ میں پہاڑ۔ دریا۔ برف اور سرسبز وادیوں کے ایسے دلکش مناظر تھے کہ ٹیگور ناچنے لگا۔ اُس کے دل نے اطمینان سا محسوس کیا۔ باپ نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ جہاں چاہے سیر تفریح کرتا رہے۔ اس مختصر قیام میں باپ نے بیٹے کی تعلیم کا بھی خیال رکھا اور خود معلّم بنے۔ اس خوشگوار سفر کے بعد ٹیگور کلکتہ واپس آگئے۔

رہبرِ اوّل

ٹیگور کے بڑے بھائی کے ملنے والوں میں سے ایک صاحب چودھری اکشے بابو تھے۔ یہ صاحب انگریزی زبان

پر خاصی مہارت رکھتے تھے اور انگریزی کے سوا بنگالی شاعری میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اُنہوں نے ٹیگور کے اندر ادب لطیف کا ذوق پیدا کیا۔ اکشیا خود دوسروں کے اشعار میں سے پڑھ کر سناتے تھے یہ ترنم ٹیگور کو بہت پسند تھا چونکہ اکشیا خود ادیب تھے اس لئے وُہ ٹیگور کی شاعری پر ادبی تنقید بھی کرتے رہتے تھے۔

راگ کے ساتھی

چودھری اکشیا کی وجہ سے ٹیگور کو ترنم میں شعر پڑھنے کا ذوقِ سلیم پیدا ہو گیا تھا۔ اب وُہ ہر نظم لے سے پڑھتے تھے لیکن ان کے ترنم میں موسیقانہ سقم ضرور تھا جس سے وُہ خود واقف نہ تھے لیکن ان کے بڑے بھائی جیوندر ناتھ ٹیگور جو علمِ موسیقی کے ماہر تھے ان کی خامی کو دیکھ رہے تھے۔ یہ بھائی اس چھوٹے بھائی کے عاشق تھے۔ انہیں بھائی نہیں دوست سمجھتے تھے چنانچہ وُہ انہیں اپنے قریب تر لے آئے اور چند دنوں میں ہی علمِ موسیقی سے مالا مال کر دیا۔ اب ٹیگور خود نئے نئے گیت اور سُریں بنانے لگ گئے تھے۔

غمگسار

ماں کے اِنتقال کے بعد گھر میں بزرگانہ شفقت کا عکس بھی موجود نہ تھا۔ باپ تھے سو وُہ ہمالیہ کی بلندیوں پر زندگی بسر کرتے تھے ٹیگور اس کمی کو ایک وقت تک محسوس کرتے رہے لیکن بھاوجہ کے آنے کے بعد یہ خلا بھر گیا۔ بھاوجہ خود صاحبِ ذوق تھیں۔ شاعرہ تھیں۔ ادیب تھیں۔ اُس نے اپنے شاعر دیور میں ادبی جوہر دیکھ کر فیصلہ کیا کہ وہ اُس کی بہترین غمگسار بن کر رہے گی۔ چنانچہ اس نیک بھاوج نے ٹیگور کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ بھاوجہ اُسے دھاری لعل چکرورتی کی نظمیں سنایا کرتی اور کبھی کبھی تو اس شاعر کو گھر بُلا کر اُس کے ادب کی داد دیتی تھی۔ اس بہانے ٹیگور کو بھی اس شاعر سے دوستی کرنے کا موقعہ ملا۔ چنانچہ ٹیگور اس شاعر کے گھر جانے لگے۔ شاعر بھی اُن سے شفقت سے پیش آتا تھا اور مزے لے لے کر اپنی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس وقت ٹیگور کے دل میں آرزو پیدا ہوئی۔

کاش میں بھی شاعر ہوتا

اس دن سے ٹیگور نے زیادہ وقت شعر و شاعری کی طرف دینا شروع کیا اور مقامی پرچوں میں اُن کا کلام شائع ہونے لگا۔ اس وقت ٹیگور کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ ٹیگور کے بڑے بھائی جیوندر ناتھ نے ایک رسالہ بھارتی نکالا۔ چنانچہ ٹیگور کو اپنے ادب کی اشاعت کا ذریعہ مل گیا۔ اب اس کی نظمیں اور مضمون چھپنے لگے۔ اس دوران میں انہوں نے ایک نظم بھی کہی جو بعد میں کتابی صورت اختیار کر گئی۔ یہی ٹیگور کی کتابِ اول ہے۔ ٹیگور نے بھنو سنگھ کے نام سے اپنا ادب شائع کرنا شروع کیا۔ لوگوں نے بھنو سنگھ کو کہنہ مشق ادیب سمجھا اور بہت قدر کی لیکن یہ راز کسی پر نہ کھل سکا۔ بہت عرصہ کے بعد ٹیگور نے خود ایک مضمون لکھا جس میں بھنو سنگھ کے ادب پر تبصرہ کیا۔ اس تبصرے کی بنا پر جرمنی نے ٹیگور کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا فرمائی۔ بعد ازاں لوگوں کو معلوم ہوا کہ بھنو سنگھ در اصل خود ٹیگور ہے۔ لوگوں نے اس مضمون کو معراجِ ادب کے نام سے یاد کیا۔

سفرِ لنڈن

ٹیگور کے خاندان میں سبھی لوگ تعلیم یافتہ اور صاحبِ عزت تھے۔ ان کے بڑے بھائی احمد آباد کے جج تھے۔ آپ اپنے بھائی کے پاس چلے گئے۔ ان کی بھاوجہ لنڈن میں تھی۔ جب آپ کے جج بھائی لنڈن جانے لگے تو وہ ٹیگور کو بھی ہمراہ لے گئے۔ انہوں نے چاہا کہ ٹیگور بیرسٹری پاس کر لے لیکن ٹیگور کی نظروں کا مرکز شعر و شاعری بن چکا تھا۔ اس نے یہ سارا وقت انگریزی شاعری اور ناولوں میں صرف کیا چنانچہ انگریزی زبان خوب بولنے اور پڑھنے لگے۔ یہاں سے انہوں نے اپنے شعر اور حالات انگلستان کو خطوط کے رنگ میں ہندوستان بھیجا اور وہ اخباروں میں چھپتے رہے۔ یہاں بھی آپ زیادہ عرصہ نہ رہے اور واپس کلکتہ چلے آئے۔ اب ان کی عمر ۲۳ برس کی ہو چکی تھی اسی سال دسمبر میں ان کی شادی ہو گئی۔ بیوی حقیقی معنوں میں شاعر کی رفیقۂ حیات تھی۔ بیوی نے شاعر کے گھر کو دبستان بنا دیا۔ ٹیگور کو گھر بھی لائبریری نظر آنے لگا۔ وہ بہت خوش تھا کہ بیوی کو اس کے جذبات و خیالات کا احساس ہے اور وہ شاعری کی طبیعت کا احترام کرتی ہے اسی خدمت نے ٹیگور کے دل میں اُس کی محبت پیدا کر دی تھی اور ٹیگور بیوی کو محبوب ہستی سمجھنے پر مجبور ہو گیا

شیلدا میں

ٹیگور نے چاہا کہ وہ غازی پور سے پشاور تک بیل گاڑی کے ذریعہ سفر کریں تاکہ یو۔پی۔ پنجاب اور سرحد کے لوگوں کی معاشرت سے آشنا ہو سکیں اور سارے ہندوستان کے تمدن سے اُن کی شاعری روشناس ہو کر علم کے خزانوں میں اضافہ پیدا کر سکے لیکن باپ نے اس سفر کی اجازت نہ دی اور انہیں شیلدا جانے کے لئے حکم دیا اور کہا کہ وہاں جا کر اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کرو۔ ٹیگور کو اگرچہ یہ ناگوار گزرا لیکن باپ کے حکم ٹالنے کی جرأت نہ ہوئی اور شیلدا چلے گئے۔ قدرت نے یہاں بھی شاعر کا ساتھ دیا اور ٹیگور کو کسانوں کی دُکھ بھری زندگی کے مطالعہ کا بہترین موقعہ ملا۔ شاعر نے ان کی داستانیں اپنے ادبی رنگ میں رنگ کر دنیا کے سامنے پیش کیں۔ دنیا نے اس انداز کو بیحد پسند کیا۔ اس زمانے میں جیوندر ناتھ کا بھارتی رسالہ ختم ہو چکا تھا۔ اب ٹیگور نے سادھنا کے نام سے ایک رسالہ نکالا اور اُسے اظہار تخیل کا ذریعہ بنا لیا۔

ذہنی تغیر

بنگال نے جب کانگریس کا اثر قبول کیا تو بنگالی ہندو اس میں پیش پیش رہا چونکہ کانگریس کا نصب العین برطانوی سامراج کو ختم کرنا تھا لہٰذا بنگال میں بھی اس کی تحریک بے جنبش نہ رہی۔ شاعر چونکہ جذباتی اور حساس ہوتے ہیں اس لئے ٹیگور بھی اس کا اثر لئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی شاعری کے رنگ میں بدل دیا۔ چنانچہ حب الوطنی اور سیاست دونوں چیزیں ان کی شاعری میں داخل ہو گئیں.... غالباً سادھنا اسی بنا پر بند ہو گیا اس کے بعد دوسرا پرچہ بنگال ریویو کے نام سے ان کی نگرانی میں نکلنے لگا۔ چونکہ سیاست کو مذہب سے فطری تعلق ہوتا ہے اس لئے ٹیگور کو بھی مذہب کی طرف جھکنا پڑا۔ ان تاثرات کے ماتحت انہوں نے بالپور میں ایک آشرم بنایا جس کا نصب العین مذہب کو ختم کر کے بنی نوع انسان کا ہم آہنگ ہونا تھا۔ بعد میں آشرم ایک کالج اور کالج سے یونیورسٹی بن گیا۔ انہوں نے اس آشرم کا نام شانتی نکیتن (امن کی جگہ) رکھا۔ اس درس گاہ کی صبح شام گیتوں سے ہوتی تھی۔ ٹیگور کے اس زاویہ نگاہ پر علامہ اقبال نے کہا تھا ع شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر لیکن یہ مصرعہ ٹیگور کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نسخہ قوموں کی زندگی میں کتنا مجرب ہے

گیتان جلی

ٹیگور نے بہت سی کہانیاں اور ڈرامے لکھے یہ کتاب آپ کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے ۔ ۱۹۰۲ء میں سولہ برس ایک ساتھ رہنے کے بعد ان کی پیاری بیوی موت کے بے رحم ہاتھوں ان سے الگ ہو گئی جس کا ٹیگور کو بیحد قلق ہوا گیتان جلی میں درا صل شاعر نے اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اپنے لئے سکون کا سامان فراہم کیا ہے بعد میں یہ کتاب بنگالی زبان میں شائع ہو گئی ۔ کتاب بیحد مقبول ہوئی پھر ٹیگور نے اپنی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جب آپ یورپ گئے ۔ تو وہاں مغرب کے مشہور شاعر مسٹر ایٹس سے ملے اور اُسے یہ کتاب دکھائی اُس نے یہ کتاب پسند کی اور اس کتاب پر اُس نے ٹیگور کی مدح سرائی کی ۔ رسالوں اور کتابوں میں ٹیگور کی دھوم مچ گئی ۔ یورپ میں کئی بار طبع ہوئی اب ٹیگور کا نام امریکہ اور انگلستان تک پہنچ گیا ۔ یورپ کے نوبل نامی شخص کی جائداد سے ٹیگور کو اس کتاب پر ۱۹۱۳ء میں نوبل انعام ملا ۔ ۱۹۱۴ء میں انگریزی حکومت نے سر کا خطاب دیا ، جسے ۱۹۱۹ء میں امرتسر جلیانوالہ باغ کے ظلم کی بنا پر واپس کر دیا ۔ ۱۹۲۳ء میں ٹیگور نے آشرم کے بچوں کو ساتھ لے کر ہندوستان کا دورہ کیا اور آشرم کے لئے چندہ جمع کیا ۔ ۱۹۲۸ء میں روس نے بھی انہیں دعوت دی اور آپ وہاں گئے اور اُس کے ملک کے انتظام سے بہت خوش ہوئے ۔

شہنشاہِ ایران نے بھی انہیں بلایا اور آپ ایران تشریف لے گئے اور واپسی پر وہاں کے ایک شاعر داؤد کو اپنے ساتھ لائے اور آشرم کی خدمت اُن کے سپرد کی تاکہ وہ بچوں کو فارسی تعلیم سے مالا مال کر سکیں ۔

آخری سانس

عمر کا بالکل آخری حصہ ٹیگور نے اسی آشرم میں گزارا چونکہ بڑھاپے کی وجہ سے صحت خراب ہو گئی تھی اس لئے آپ دن میں بیٹھے بیٹھے کتابیں لکھتے رہتے تھے ہوتے ہوتے صحت نے بالکل جواب دے دیا اور ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے بہت بڑے شاعر کی موت کی خبر سُنی گئی ۔ یہ خبر ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو بدقسمت ہندوستان نے سُنی اور دل تھام کر رہ گیا ۔ ایسی ہستیوں کو موت فنا نہیں کر سکتی البتہ ان کے جسم کو ہم سے جدا کر دیتی ہے ٹیگور کا نام ہندوستان اور دنیا بھر کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

حیاتِ اقبالؒ

علاّمہ اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام شیخ نور محمد تھا۔ جو نہایت مرنجاں مرنج قسم کے بزرگ اور شفیق باپ تھے۔ ان کی والدہ نے اپنے ہونہار بیٹے کی تربیت جس محبّت اور سلیقہ سے کی اس کا اظہار اس نظم کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے۔ جو علاّمہ مرحوم نے اُن کے انتقال پر کہی تھی ؎

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزّت ہوا

علاّمہ کو بچپن میں ایک نہایت شفیق اور متبحر عالم مولانا میر حسن کی ہدایت میسر آئی۔ اقبال ایسے ہونہار شاگرد کی صلاحیتوں کو مولانا نے جس خوبی سے اُجاگر کیا۔ اس کا اعتراف علاّمہ نے بانگِ درا کی ایک نظم میں کیا ہے اور جب تک مولانا زندہ رہے اقبال ان کے سامنے شاگردانہ سعادت مندی کا اظہار کرتے رہے۔ مولانا کی زیرِ نگرانی ان کی طبیعت کے اصلی جوہر چمکنے لگنے لگے تھے اور سکول ہی میں اُنھوں نے شاعری کی طرف توجہ شروع کر دی تھی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال نے پرائمری مڈل

اور میٹرک کے امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا۔ اور اِس دوران میں وہ غیر معمولی قابلیت کا اظہار کرتے رہے اسی زمانہ میں انہوں نے رومی کا باقاعدہ مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد علامہ اقبال لاہور چلے آئے۔ جہاں اُنہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا یہاں انہوں نے پروفیسر آرنلڈ ایسا قابل استاد پایا جس نے اپنے شاگرد کی غیر معمولی ذہانت کو فوراً بھانپ لیا۔ اور اس کی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔

لاہور میں ان دِنوں مشاعرے خوب ہوتے تھے۔ اور اقبال بھی ان میں اپنا کلام سُنانے لگے تھے بی۔اے کے امتحان میں اُنہوں نے پھر وظیفہ لیا اور عربی اور انگریزی میں اوّل رہے۔ ایم اے پاس کرنے پر انہیں سونے کا ایک تمغہ ملا۔ اور وہ اورنٹیل کالج میں فلسفہ پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ اب ان کی شاعری کا بہت چرچہ ہو چلا تھا۔ ۱۸۹۹ میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی نظم "نالۂ یتیم" پڑھ کر سنائی۔ جس نے سُننے والوں کو بے چین کر دیا۔ اسی زمانے میں ان کی نظمیں "ہمالہ" اور "ہندوستان ہمارا" شائع ہوئیں اور اُردو داں طبقہ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ انہی دِنوں اقبال نے خط و کتابت کے ذریعے داغ سے بھی غزلوں میں اصلاح لی۔ لیکن جلد وہ اس ضرورت سے بے نیاز ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اقبال پر وطنیت کا گہرا اثر تھا۔ اور انہوں نے "نیا شوالہ" اور "تصویرِ درد" میں ان جذبات کا اظہار کیا تھا۔

اورنٹیل کالج سے اقبال گورنمنٹ کالج چلے گئے۔ ۱۹۰۵ میں وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے کیمبرج میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے ڈگری لینے کے بعد انہوں نے ایران کے فلسفہ مابعد الطبیعات پر ایک کتاب مکمل کی۔ جس پر جرمنی کی مشہور میونخ یونیورسٹی نے انہیں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری دی جرمنی سے وہ واپس انگلستان آئے۔ یہاں اُنہوں نے لندن میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ کچھ

عرصہ آپ پروفیسر آرنلڈ کی جگہ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے - قیام یورپ کے دوران میں اقبال کے خیالات میں گہرا تغیر ہوا - یورپ کی تہذیب اور یہاں کے حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ نے ان کو مغربی نظام سے بہت متنفر کر دیا - شدید قومیت کے خطرناک رجحانات نے انہیں بین الاقوامیت کا دلدادہ بنا دیا - اور اب انہیں ایک ایسے ضابطۂ حیات کی تلاش شروع ہوئی جو رنگ و نسل اور قومیت کی مصنوعی حدود سے بالاتر ہو - اس دوران میں ان کے کلام میں جستجو اور طلب کا احساس بہت نمایاں ہے -

اقبال نے مشرق کے انحطاط کے اسباب پر غور کیا - اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے - کہ مشرق بالعموم اور مسلمان بالخصوص بعض ایسے نظریوں کی وجہ سے سیاسی اور ذہنی انحطاط کا شکار ہوئے ہیں - جن کا لازمی نتیجہ خودی کی موت ہے - چنانچہ یورپ سے واپس آنے پر انہوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا جس کا ماحصل یہ تھا - کہ ہر فرد میں بے مثل صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اور شخصیت کے ارتقا کا تقاضا ہے کہ ان صلاحیتوں سے پورا کام لیا جائے - زندگی ایک متحرک قوت کا نام ہے اور وہ ہر دم نئی آرزوئیں اور نئے مقاصد پیدا کرتی ہے ان آرزؤں اور مقاصد کی تکمیل شخصیت کو ابھارتی ہے - انسان قدرت کا شاہکار ہے - اور اس شخصیت کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی خوابیدہ قوتوں سے کام لے کر فطرت پر چھا جائے - زندگی ہر لحظہ دشواریوں سے روشناس ہوتی ہے اور ان دشواریوں کو دور کرنے اور ماحول کو مسخر کر لینے سے شخصیت کی پوری نشو و نما ہوتی ہے اور خودی کو تقویت ملتی ہے - اپنے خیالات کو اقبال نے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" میں پیش کیا - جن میں انفرادی اور اجتماعی خودی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی - اقبال نے مشرقی اور مغربی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا - رومی کا اثر ان پر خاص طور سے نمایاں ہے - نطشہ اور اقبال کے مردِ کامل میں بھی بعض باتیں مشترک ہیں - لیکن دونوں میں بنیادی اختلافات موجود ہیں -

یورپ سے واپس آکر، اقبال نے گورنمنٹ کالج میں اپنا کام سنبھال لیا تھا۔ لیکن جلد وہ اس سے مستعفی ہو گئے۔ اور انہوں نے بیرسٹری شروع کر دی۔ بانگ درا کے بعد ان کی مشہور کتاب پیام مشرق چھپی جو انہوں نے گوئٹے کی کتاب "سلام مغرب" کے جواب میں لکھی تھی۔ اسرار و رموز کی طرح پیام مشرق بھی فارسی میں لکھی گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس زبان کے ذریعہ اپنا پیام تمام دنیا اور بالخصوص دنیائے اسلام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد زبور عجم اور جاوید نامہ بھی فارسی میں لکھی گئیں ان کتابوں کے بعد علامہ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے ذریعہ اُردو دان طبقہ سے پھر مخاطب ہوئے۔ اور ان کے بعد پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق کے نام سے فارسی میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اُن کی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں اُردو اور فارسی دونوں میں نظمیں اور رباعیاں کہی گئی ہیں۔ یہ کتاب اُن کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ ان کتابوں کے علاوہ علامہ نے انگریزی میں ان لیکچروں کا مجموعہ شائع کیا۔ جو مدراس میں دیئے گئے تھے۔ ان کا تعلق مذہب اور فلسفہ سے ہے اور اقبال کا فلسفہ سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

علامہ اقبال ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی ہوئے اور گول میز کانفرنس میں بھی انہوں نے دوبارہ شرکت کی لیکن سیاست میں جس چیز نے علامہ کو غیر فانی شہرت بخشی۔ وہ پاکستان کا تصور تھا۔ جو انہوں نے الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سنہ ۱۹۳۰ء کے اجلاس میں پیش کیا۔ اسی تصور کو دس سال بعد مسلم لیگ نے اپنا نصب العین بنایا

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے دن اس بطلِ عظیم۔ مفکرِ ملت اور شاعرِ مشرق نے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ا۔الف: اپنی ہی خوشی سے اے خدا تُو نے مجھے غیر فانی بنایا ہے۔ میرے فانی جسم کو تم بےشمار مرتبہ مٹا کر ہی اسے نئی زندگی سے سرفراز کرتے ہو۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا بُوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی؟
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

بالِ جبریل

سطح بین نگاہوں کے لئے مذکورہ بالا فلسفۂ حیات کے تحت ٹیگور اور اقبالؒ کا مقام فکر ایک ہی ہے، لیکن ہمارا وہ صاحب ذوق حلقہ جو اقبالؒ اور قرآن کے نزدیک پہنچ کر علم تحقیق کی روشنی میں دماغی کاوش اور قلبی رُوحانیت میں ایک نمایاں امتیاز دیکھتا ہے، فکرِ ٹیگور کو ہندو مت کے مسئلہ اواگون میں اُلجھا ہُوا پاتا ہے۔

ب: اس چھوٹی سی بنسری سے روز نئے اور میٹھے نغمے پیدا کر کے تم نے دُنیا کی پہاڑیوں اور وادیوں کو نغمہ ریز کر دیا ہے

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

بالِ جبریل

ٹیگور کی قوّتِ گویائی سے صرف پہاڑ اور وادیاں ہی مسحور ہو سکیں اور اس کے نغمات پہاڑوں سے بلند اپنا مقام پیدا نہ کر سکے، لیکن اقبالؒ کی نوائے شوق سے حریم ذات میں ایک شور اُٹھا اور ہر بتکدۂ صفات میں اقبالؒ کا تخیّل پہنچا۔ یہاں تک کہ ہر عبادتگاہِ عظمےٰ میں ایک حشر برپا کر دیا۔

ج: میرا یہ چھوٹا سا دل تمہارے غیر فانی نور کے چھو جانے سے مسرّتوں اور تخیلات میں سراپا محو ہو جاتا ہے، ان ناتواں اور چھوٹے ہاتھوں میں مَیں تمہارے اَن گنت کرم دیکھتا ہُوں۔ زمانے پہ زمانہ بیت جاتا ہے لیکن تمہارے کرم ختم نہیں ہوتے اور میرے ہاتھوں میں انہیں پانے کے لئے جگہ بنی ہی رہتی ہے۔

مِٹا دیا مِرے ساقی نے عالمِ من و تُو
پلا کے مجھکو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اسکے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادُو
بالِ جبریل

ٹیگور کی نگاہِ مطالعہ جب اس وسیع دُنیا کے گوشوں میں پہنچتی ہے تو اس کی رنگینیاں بنی نوعِ انسان پر اللہ کا احسانِ عظیم نظر آتی ہیں، لیکن ٹیگور کور نگاہی کے باعث اپنا مقام (مقامِ بشریت) نہیں پہچان سکتا، اسکے برعکس اقبالؒ عالمِ من و تو کی منزلیں طے کر کے مقامِ یکتائی پر پہنچ گیا ہے اور اقبالؒ کے نزدیک دُنیا کی یہ تمام رنگینیاں انسان کے باعث ہیں۔ انسان ان کا منّت پذیر نہیں ہے۔

۱. ولف: تمہارے گیتوں کا اشارہ پاکر میرا دل غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا معلوم ہوتا ہے، اور میں جب تمہارے نور کی طرف نگاہ کرتا ہوں تو ان جلووں سے میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔

کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا؟
تیری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز
بالِ جبریل

ٹیگور کی آرزو کے دیدار میں حوصلۂ دید نہیں ہے۔ یہ مقام تو صاحبِ نظر ہی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ مادیات میں الجھنے والی نگاہیں اس قابل کہاں کہ انہیں تابِ نظارہ ہو۔ اقبال رح اسی نظارے اور اسی ایک نگاہ کو اپنی حیات تو سمجھتا ہے۔

ب: میری زندگی میں جو بھی تلخیاں ہیں سب میٹھے سروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور میری محبوب دعائیں اس پنچھی کی طرح پر پھیلاتی ہیں جو سمندر پار کرنے کا تہیہ کر کے اڑتا ہے۔

میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک!
بالِ جبریل

ٹیگور اپنے تئیں سہاروں کا فریب دے کر مطمئن ہو جاتا ہے، اور اپنی خوشگوار زندگی کے تصور کی عمارت کو دعاؤں کے دلفریب ستونوں پر استوار کرتا ہے، لیکن اقبال رح کا نظریۂ خودی بالکل جداگانہ ہے وہ کہتا ہے کہ میرا غنچۂ حیات میری اندرونی قوتوں کے زور سے ہی کھلتا ہے جس پہ ناز ہے۔ اور شان قلندرانہ ہے، گدایانہ نہیں۔

ج: مجھے معلوم ہے کہ میرے گیتوں سے
تم خوش ہوتے ہو، لیکن اس وقت
تمہاری خدمت میں مَیں اپنے آپ کو
ایک مغنی کے بھیس میں ہی پاتا ہُوں۔

شعر سے روشن ہے جانِ جبرئیل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرورِ انجمن
شعر گویا رُوحِ موسیقی ہے رقص اُسکا بدن

ضربِ کلیم

اس میں کلام نہیں کہ بظاہر دونوں حضرات
کے تخیلات و نظریات ایک ہی مرکز کے
گرد طواف کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے
کہ کیا ٹیگور کے گیتوں میں وہ پیامِ زندگی
ہے جس کی جستجو نے اقبالؒ کو دیوانہ
بنا رکھا تھا اور آخر اُن پھولوں نے اقبالؒ
کی آب و گِل سے نمودِ زندگی حاصل کی۔

د: میرے محبُوب! مَیں تمہارے نایاب قدموں
کو اپنی طاقتِ سخن کی پرواز سے چھُو
پاتا ہوں اور میں نغموں میں بیخود ہو
کر اے میرے مالک! تجھے اپنے بچپن
کا دوست پکار اٹھتا ہوں۔

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج

ضربِ کلیم

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

بانگِ درا

چونکہ ٹیگور کی نگاہ مادہ پرست ہے، چنانچہ وہ صرف مادی دُنیا کے مناظر تک پہنچ سکتا ہے، اور ان رنگینیوں میں قدرت کے جلووں کو پاکر محظوظ ہوتا ہے۔ اور وجد میں آکر اپنے معبود کو محض بچپن کا دوست سمجھ پاتا ہے۔ جوانی یا بقیہ عمر کا نہیں، لیکن اقبالؒ کا ولولۂ شوق چاند اور سورج تک کے نظاروں کو تاراج کرتا ہوا، ستاروں سے آگے گذر جاتا ہے اقبالؒ کے نزدیک یہ آسمان، یہ تارے، یہ چاند، مقامِ نظر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ان مقامات سے باخبر ہو، بے خبر کی نگاہ واقعی ٹیگور کی نگاہ سے بلند نہیں ہو سکتی۔

۲۔ الف: مَیں حیرت میں ڈوب کر اور محو ہو کر تمہارے نرالے نغموں کو سُنا کرتا ہُوں۔ اے خدا میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم کس طرح گاتے ہو؟

خبر عقل و خرد کی ناتوانی
نظر دل کی حیاتِ جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز
سزاوارِ حدیثِ لن ترانی!

ارمغانِ حجاز

جہاں تک فہم و ادراک کا تعلق ہے ٹیگور اس مقامِ شناسائی تک پہنچ جاتا ہے جہاں جا کر عقلِ انسانی کسی خبر سے روشناس ہو سکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ٹیگور خود اقرار کرتا ہے کہ "میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم کس طرح گاتے ہو؟ وہ بیچارہ مقامِ کبریائی کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لئے کہ وہ دماغی کد و کاوش کے زینے سے مقامِ خبر تک پہنچتا ہے، دل کی نظر چراغِ منزل نہیں بنتی۔

ب۔ تمہارے نغموں کا نور سارے عالم کو منوّر کرتا ہے۔ اور تمہارے نغمے کی لہر حیات فرش تا عرش لہرا جاتی ہے، اور تمہارے نغمے کی مقدس آبشار تمام رکاوٹوں کو پار کر کے آگے ہی بڑھتی رہتی ہے۔

تو ہے میرے کمالاتِ ہنر سے
نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

ارمغانِ حجاز

ٹیگور خداوندِ لم یزل کو زیادہ سے زیادہ آفتاب کی جہاں تاب شعاعوں میں دیکھتا ہے۔ لیکن اقبالؒ کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تجھے نیازِ مقدس منظور و مطلوب ہے، تو اپنے تئیں دیکھ لے۔ گویا اقبالؒ کے نزدیک وجودِ بشر ہستیٔ قدرت کی بیّن شہادت ہے اور یہ حقیقت ہے۔

ج: میرا دل بھی تیرے نغموں کا ساتھ دینے کے لئے کس قدر بے چین رہتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس میں وہ آواز پیدا نہیں ہوتی میرے بولنے کی حقیقت سر دل میں نہیں آتی، اور میں لاچار ہو کر سسک اٹھتا ہوں۔ اے میرے خدا! تُو نے ہی تو میرے دل کو اپنے دامِ نغمہ میں قید کر رکھا ہے۔ اور اے میری زندگی کے مالک! میں تمہارا چھُونا محسُوس کرتا ہُوں۔ اس لئے میں اپنے جسم کو پاکیزہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔

ج خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نُورِ لَآاِلٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

ارمغانِ حجاز

ٹیگور واقعی بیتاب نظر آتا ہے کہ وہ کسی طرح سے قربِ الٰہی حاصل کر لے اور وصل کے مزوں سے لطف اندوز ہو جائے۔ لیکن وہ نُور جس کی اسے تلاش ہے وہ تو صرف دل کی نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ اور جب تک کوئی لَآاِلٰہ کے مقامات سے باخبر نہ ہو وہ قُرب، وہ وصال اور وہ شرف حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ٹیگور قرآن کی روشنی میں سفر طے نہیں کر رہا، اس لئے بیچارہ بھٹکتا پھرتا ہے۔

ٹ: اے خدا، تم صادق ہو، تم ہی نے میرا دل علم و دانش سے روشن کیا ہے۔ اس لئے میں جھوٹ سے اپنے خیالات کو ہمیشہ دُور ہی رکھنے کی کوشش کروں گا۔

ا: کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

ارمغانِ حجاز

ٹیگور نے چونکہ دماغی محنت کے باعث مقامِ خرد حاصل کیا ہے، اس لئے وہ اسے نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر شکر گذار ہے۔ لیکن اقبالؒ اس عالمِ رنگ و بُو کو نگاہِ خرد سے نہیں بلکہ نگاہِ دل سے دیکھتا ہے۔

۴۔ الف: میرا من مندر جو تیرے رہنے کا مقدس مقام ہے، اسلئے میں اسے تمام آلائشوں سے الگ رکھ کر پھول جیسا پاکیزہ اور نازک بنانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

وہ میرا رونقِ محفل کہاں ہے؟
مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے؟
مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں
خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے؟

ٹیگور نے ہزار جستجو کے بعد اتنا معلوم کیا کہ خدائے بزرگ و برتر کا مقام انسان کا قلبِ مقدس ہے لیکن یہ پھر بھی نہیں سمجھا کہ اپنے دل کا مقام کونسا ہے؟ بالِ جبریل

ب: تمہاری طاقت کے بھروسے پر میں اپنے تمام کاروبار کو تمہارے ارادوں میں شامل کر کے مکتی حاصل کروں گا۔

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے میرے سینے میں آتشِ اللہ ھو
تجھ سے میری زندگی سوز و تب و درد و غم
تو ہی میری آرزو، تو ہی میری جستجو! بالِ جبریل

صوفیوں کے خیال و اعتقاد کے مطابق تقویٰ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تقویٰ پر ایمان کامل ہوتا ہے اور وہ تدبیر کو چھوڑ کر تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں، یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی دنیا آپ پیدا نہیں کر سکتے اور تقویٰ کے بعد تسلیم و رضا کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں جا کر انسانی قوتیں شل ہو جاتی ہیں اور وہ حوادثِ زمانہ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اور یہ جھک جانا ہی مانعِ تدبیر و عمل ہے جو مقامِ مومن کی بلندیوں اور سرفرازیوں کو پست اور زوال میں لے جاتا ہے۔ مردِ مومن کامل سعیِ پیہم اور اپنی تقدیر کا آپ خدا بن جاتا ہے۔

۵۔ الف: مَیں اپنے ہاتھ کے اس کام کو تو پھر بھی ختم کر لوُں گا لیکن مجھے ایک لمحہ کیلئے اپنے قریب بیٹھنے دو۔ تمہارے درشنوں سے دُور رہ کر میرے دل کو نہ تسکین ملتی ہے اور نہ ہی سکون۔

۵ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر!
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

بالِ جبریل

ٹیگور کا اندرون چونکہ نورِ خودی سے خالی ہے اس لئے وہ ہر مقام پر منت کشِ جلوہ ہوتا ہے حالانکہ بشر کیلئے یہ نہایت معیوب ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہو کر ہر چیز کے حضور میں گڑگڑاتا رہے۔ انسان میں تو اقبالؒ سی جرأت ہونی چاہیئے کہ وہ خدا کے جلووں کو دعوتِ نیاز دے۔

ب: محنت کے اِس بحرِ بیکراں میں مجھے اپنی محنت غیر فانی معلوم ہونے لگتی ہے۔ آج گرمی کا موسم ہے، میرے صحنِ گلستاں میں گنگناتا ہُوا آیا۔ شہد کی مکھیاں، میٹھی بُو والے پھولوں کے گچھے پر گنگنا رہی تھیں۔

۵ ہُوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گُل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خُونی کفن
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام
سُناتی ہے یہ زندگی کا پیام

بالِ جبریل

ٹیگور کے مطالعہ کی انتہا عالمِ رنگ و بو تک محدود ہے۔ کہیں گل و بلبل، اور کہیں شمع و پروانہ کی کشمکشِ حیات میں اُلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اقبالؒ انہی جلوؤں اور بہاروں میں پیامِ حیات سنتا ہے۔ فلسفہٗ موت و حیات پر اسی مردِ مومن کی نگاہ جا سکتی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ جہان اور اس کی رنگینیاں میری وجہ سے قائم ہیں۔ مَیں ان کی وجہ سے قائم نہیں ہُوں۔

ج: یہی تو وقت ہے کہ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر زندگی کے گیت گاؤں۔

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گُل روز روز

بالِ جبریل

۵- الف: توڑ لو، اس چھوٹے سے پھول کو، ایسا نہ ہو
کہ کہیں دیر ہو جائے اور وہ مرجھا کر
دھول میں گر پڑے۔

۵
توڑ لینا شاخ سے تجھکو مرا آئیں نہیں
یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
"بانگِ درا"

اقبالؒ نے اُس نگاہ کو جو فقط عالمِ رنگ و بُو میں کھو جاتی ہے 'چشمِ صورت بیں کہا ہے' اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ وہ آنکھ جو علت یا سیرت تک نہیں پہنچتی وہ کور نہیں تو اور کیا ہے؟ ٹیگور پھول کی نمائشی زندگی سے متاثر ہے اور اقبالؒ اسکی موت میں بقائے دوام دیکھ رہا ہے۔

ب: تمہاری مالا میں بے شک اسے جگہ نہ ملے
مگر اسے اپنے ہاتھ سے توڑے جانے کی
عزت تو بخشو۔

۵
کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا؟
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا
بانگِ درا

ٹیگور اسی کا متمنی ہے کہ پھول کو کوئی توڑ ضرور لے۔ خواہ شاخ سے الگ کرنے کے بعد پاؤں تلے مسل دے حالانکہ یہ پھول کی توہین ہے پھول کا مقام کسی کا زیبِ گلو ہونا ہے۔ بیکار ضائع ہو جانے کے لئے وہ عالمِ وجود میں نہیں آیا۔ اُس کا حسن تو نگاہِ شوق کیلئے پیدا ہوا ہے۔

ج : ڈر ہے کہ مجھے پتہ بھی نہ چلے، اور دن ختم ہو جائے اور عبادت کا وقت نکل جائے۔

ترا نیاز نہیں آشنائے ناز ابھی تک
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز ابھی تک

"ضربِ کلیم"

ح : اس کا رنگ بے شک ہلکا ہی ہو اور خوشبو بھی تیز نہ ہو، پھر بھی اس پھول کو وقتِ معیّن سے پہلے توڑ لو۔ اور اسے اپنی خدمت کا شرف بخشو۔

فطرت کو خرد کے رُو برُو کر
تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تُو کر

بالِ جبریل

ٹیگور بار بار پھول کو شاخ سے توڑ لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کا مقصودِ نمود یہی ہے کہ اسے خدمت کا شرف بخشا جائے لیکن اقبالؒ اس مادی دنیا کو تسخیر کرنے کا حکم دیتا ہے تا کہ انسان اس میں اُلجھ کر نہ رہ جائے۔

۷. الف: میرے گیتوں نے اپنے سازِ دل سے رخصت لے لی ہے، اور ان گیتوں کی سج دھج اور لباس کی شان و شوکت سے غرور نہیں ہے۔ کیونکہ یہ زیورات اور بناوٹ کے سامان میرے اور تمہارے درمیان رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور ان کی جھنکار سے تمہاری دھیمی آواز سنائی ہی نہیں دیتی۔

نگہ اُلجھی ہوئی ہے رنگ و بُو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سُو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبحگاہی
اماں شاید ملے اَللہُ ھُو میں

بالِ جبریل

ٹیگور نے اپنا اندازِ سخن اور طرزِ بیان بدلا، اور انہیں زیبائش سے مطلق الگ کر دیا اور سمجھا کہ شاید شاعرانہ تشبیہوں اور استعاروں سے نجات پاکر میری شاعری میں روحانیت آجائے گی۔ شاعری جس کی خدا نے خود مخالفت فرمائی ہے، اگر وہ مقامِ اَللہُ ھُو پر نہیں ہے تو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہے۔ اقبالؒ نے اسی فغانِ صبحگاہی کی تاکید کی ہے جس کے راز میں انسان کی نجات ہے۔

ب: تمہارے حضور میں میرا شاعرانہ غرور پانی پانی ہو جاتا ہے۔ اور میرے سب سے بڑے شاعر ہیں تمہارے قدموں میں بیٹھا ہوں، میری زندگی کو سچی اور سادہ بنا دے۔ اُس بنسری کی مانند جو نغموں سے بھرپور ہوتی ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُوبرو
پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبُو

بالِ جبریل

ٹیگور نے خدا کو سب سے بڑے شاعر کے خطاب سے مخاطب کیا ہے، اور یہ دلیل ہے کور نگاہی کی۔ پھر اس سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے اور یہ شانِ قلندری کے سراسر خلاف ہے، اور تمنّا کرتا ہے نعمات کی، جو اکتسابی شے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔
لیکن اقبال ایک ایسے سرور کا طالب ہے جس کی مستی انسان کو کون ومکان سے باخبر کر دیتی ہے۔

۸۔ الف جس بچے نے شاہی لباس اور موتیوں کی مالا پہن رکھی ہو، وہ آزادانہ کھیل کود سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قدم قدم پر وہ چیزیں اسکے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ اس ڈر سے کہ کپڑے مٹی میں میلے نہ ہو جائیں، یا پھٹ نہ جائیں، وہ دنیا سے الگ ہی رہتا ہے۔ اور چلنے پھرنے میں بھی احتیاط سے کام لیتا ہے۔

ب

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

"بالِ جبریل"

رہائشی شان و شوکت۔ لباس کی زیبائش اور ایسی قسم کی دوسری خودنمائیاں اور نمائشی چیزیں ٹیگور کی نگاہ میں صرف اس لئے درست نہیں ہیں کہ آدمی میں محتاط رہنے کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ احتیاط بذاتِ خود ایک جوہر ہے جس سے خالی رہنا بے شعوری کی دلیل ہے اقبالؒ نے اسی تخیل اور اسی شے کو اس واسطے معیوب سمجھا ہے کہ ان چیزوں میں تصنع کی جھلک اور مغربیت کا اثر نظر آتا ہے۔ ان چیزوں کے رہنے سے وہ سادگی جسے آدابِ جنوں کہا ہے۔ مفقود ہو جاتی ہے۔

ب۔ اے ماں! کیا فائدہ اس ٹھاٹھ باٹھ کا کہ دھرتی ماتا کی صحت افزا دھول سے الگ رہا جائے۔ کیا فائدہ ہے اس سے کہ دُنیا کے راحت و آرام میں انسان حصّہ نہ لے سکے۔

حکیمی نا مسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

(بالِ جبریل)

ٹیگور دُنیا کے اُمرا کو اس لئے حقارت سے دیکھتا ہے کہ وہ تکلفات کی آگ سے نکل کر بے نیازی کی جنّت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن اقبالؒ اِس سادگی اور غریبی کو اس مقامِ فقیری پر دیکھتا ہے جہاں کہ اس جوہر سے انسان اپنی خودی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اور شہنشاہیت کو اس لئے حقیر سمجھا ہے کہ اس مقام پر انسانیت ذبح ہوتی ہے۔

۹. الف: کیسا مورکھ ہے، ارے اپنے ہی کندھوں پر اپنے آپ کو چڑھا کر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ واہ رے بھکاری اپنے ہی دروازے پر بھیک مانگ رہا ہے (یہ فقیری نہیں ہے۔ فقر کا تو مقام ہی اور ہے)

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
دل اگر خاک میں زندہ و بیدار ہے
تیری نگاہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ!

بالِ جبریل

ٹیگور کی نگاہ میں وہ شخص جو جدوجہد سے کام لینا چاہتا ہے اور خدا کے نام پر نہیں بیٹھا رہتا، وہ مورکھ ہے۔ حالانکہ وہی زندہ ہمّت ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک دوسرے کے دروازے پر جاکر بھیک مانگنا، خواہ وہ دروازہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو خلافِ شانِ قلندری ہے۔

ب: اپنے تمام بوجھ تو اس ذات پر چھوڑ دے جو نہیں اٹھانے کی ہمّت رکھتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں پچھتانا پڑے۔

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

بالِ جبریل

ٹیگور دُنیا کو یہ تعلیم دیتا ہے تقدیر پر شاکر رہ کر اپنے تمام کاروبار خدا پر چھوڑ دئے جائیں۔ لیکن اقبالؔ اسی تقوی کو کافری کہتا ہے۔ اور اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ اگر انسان مومن ہے تو وہ تقدیر کے تابع نہیں ہے بلکہ تقدیر اسکے تابع ہے۔

ج : تیری تشنگی کی سانس دِئے کی اس لَو کو بجھا دیتی ہے، ناپاک ہے یہ سانس۔ اس کے ناپاک دامن میں کوئی تحفہ نہ لینا، لیکن جو پاک محبّت سے ملے، اُسے قبول کر لینا۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

بالِ جبریل

نفسِ انسانی کی پاک و ناپاک خواہشات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ٹیگور آدمی کے اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن اقبالؒ ان چیزوں سے بہت بلند ہو کر بے نیازی کی تعلیم دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ مجازی منازل سے بے نیاز ہو کر عروجِ انسانیت حاصل کر لو؛

۱۰- الف :- جہاں غریب اور نیچ لوگ بھٹکتے ہوئے رہتے ہیں
اُس جگہ پر تمہارے قدم رہتے ہیں اور وہی تمہارا
صحیح مقام ہے اور جب میں سلام کرنے کیلئے جھکنے کی
کوشش کرتا ہوں، تو میرا سلام اُس بستی میں
جہاں تم رہتے ہو پہنچ نہیں پاتا۔

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میری نماز بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
ضربِ کلیم

ٹیگور کی نظر میں شکست لوگ نیچ اور غریب ہیں لیکن اسلام کے نزدیک انسان کو نیچ کہنا خطا ہے اور اقبالؒ کے نزدیک غریب اور نیچ وہ ہے جو اپنے اندر سرمایۂ خودی نہیں رکھتا۔ ٹیگور نے مقامِ فقر کو سمجھا ہی نہیں، اس کے ساتھ ساتھ ٹیگور کو شکایت ہے کہ اس کا سلام خدا کے حضور تک نہیں پہنچ پاتا۔ اور اقبالؒ کہتا ہے کہ اگر عبادت میں ذوقِ قلب شامل نہیں ہے تو وہ سراپا حجاب ہے۔

ب :- جہاں تم غریب لباس میں گھومتے پھرتے ہو
وہاں غرور بھٹکنے نہیں پاتا

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
"بانگِ درا"

چونکہ ٹیگور سمجھتا ہے کہ خدا صرف غریب، مفلس اور نیچ طبقے کے لوگوں کی بستی میں مقیم ہے اسلئے وہ اونچے طبقے کے آدمیوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تمہاری امیری اللہ اور اللہ کے بندوں کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تم خدا کی رہائش گاہ تک نہیں جا سکتے لیکن اقبالؒ کہتا ہے کہ خدا کے حضور میں پہنچکر آقا و غلام و بندہ و بندہ نواز اور امیر و غریب میں کوئی تمیز ہی نہیں رہتی۔

ج۔ جہاں غریب اور کنگال رہتے ہیں، جن کا کوئی ساتھی نہیں ہے، تم ساتھی بنے رہتے ہو، وہاں میرا دل پہنچنے میں عاجز ہے۔

ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلاہ داری!
"ضربِ کلیم"

ٹیگور اپنی کمزوری نگاہ کی وجہ سے پھر دھوکہ کھاتا ہے اور اپنا مقام نہیں پہچان سکتا۔ اس کی نگاہ بار بار نیچ اور غریب لوگوں پر جاتی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ خدا انہیں لوگوں میں ہے، لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ خدا کا مقام، انسان کا دل ہے، تونگری نہیں۔

الف : اِس عبادت اور ان گیتوں کو ترک کر دے، تو عبادتگاہ کے اندر دروازے بند کر کے آنکھیں بند کئے کس کی عبادت کرتا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھ، تیرا معبود کیا تیرے سامنے نہیں ہے؟

ب : وہ تو وہاں ہے جہاں کسان ہل جوت رہا ہے۔ یا وہاں جہاں سڑک پر مزدور پتھر توڑ رہا ہے۔ ان دھول بھرے کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ وہ دھوپ اور بارش میں ان کا ساتھی ہے، تو بھی اپنے مقدس خیالات کو چھوڑ کر اس دھول سے لطف اندوز ہو جا۔

پردہ چہرے سے اُٹھا انجمن آرائی کر
چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

بانگِ درا

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی

بالِ جبریل

ٹیگور تھوڑا سا راستہ صحیح روشنی میں چلتا ہے لیکن پھر ایسی تاریک غار میں جا گرتا ہے کہ جہاں پہنچ کر روشنی کی جھلک تک نظر نہیں آتی، چنانچہ وہ پھر خدا کو کسانوں اور دھول بھرے مزدوروں میں ہی دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکے برعکس اقبال کہتا ہے کہ محبت ذات پات اور امیری غریبی نہیں دیکھا کرتی جس کے سینے میں محبت کی گرمی ہو وہی اپنے محبوب کا وصال حاصل کر سکتا ہے۔

ج : نجات! لیکن کہاں ملے گی وہ؟ ہمارے مالک نے تو اپنے آپ کو خود ہی ایک موجد کی گرفت میں خوشی سے ڈال رکھا ہے، اور وہ ہمارے ساتھ بھی اپنی خوشی سے بندھے ہوئے ہیں۔

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

بالِ جبریل

ٹیگور اپنی نجات سے مایوس نظر آتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو بھی اپنے مدوجزر میں بندھا ہوا دیکھتا ہے۔ اقبال بتاتا ہے کہ وہ انسان جو اپنے تئیں ایک پیکرِ خاکی سمجھتا ہے، اُسے نجات مِل ہی نہیں سکتی، کیونکہ بدن کے مرنے سے رُوحِ انسانی فنا نہیں ہوتی۔

ٹ: عبادت گاہ چھوڑ کر باہر آجا اور ان پھولوں اور چڑھاوے کو ایک طرف کر دے، اگر تیرا لباس میلا اور بوسیدہ بھی ہو جائے تو اس سے ہرج ہی کیا ہے؟ مِل جا اس مزدور کے ساتھ، اور اس سے مل کر محنت کر۔

ا: عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بالِ جبریل

ٹیگور کا یہ تخیّل قابلِ عزّت ہے کہ وہ انسان کو بنی نوعِ انسان سے مل جل کر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن کاش اس کی نگاہ اس سے بلند ہوتی مگر افسوس کہ اس کی نظر پھر موجودات سے ٹکرا جاتی ہے۔ اقبال نے اسکے اسی تخیّل کو یُوں واضح کیا ہے کہ اس مقام پر امیر اور غریب کا سوال ہی نہیں ہے یہاں تو محض اعمال کی پرسش ہوتی ہے۔ اور ہر انسان اپنے ذاتی عمل سے اپنا دُکھ سُکھ پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اعمال کی نقد قیمت سے جنّت اور دوزخ خریدتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ذات پات اور اُونچ نیچ کی تمام بندشیں ٹُوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور نسب ناموں کا سارا طلسم ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

الف : سفر لمبا ہے اور اسکے طے کرنے کا وقت بھی۔ روشنی کی پہلی کرن پر سوار ہو کر میں ساتوں طبق گھوم کر ان گنت ستاروں اور بُرجوں میں اپنے نقشِ قدم چھوڑ آیا ہُوں۔

۔ قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

بالِ جبریل

ٹیگور کی معراجِ پرواز ستاروں اور آفتابی شعاؤں تک ہی محدود رہی، وہ اس سے آگے نہ جا سکا۔ اس کے برعکس اقبال ؒ نہ جانے کتنے مقامات اور معلوم کر چکا ہے؟

ب : بہت دُور کی منزل بھی تمہارے قدموں میں خود چل کر آجاتی ہے لیکن سادہ نغمہ پیدا کرنے کی مشق ہی دُشوار ہے۔

۔ یُوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمّتِ مردانہ
میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جُرأتِ رندانہ

بالِ جبریل

ج: اپنے دروازے پر پہنچنے کے لئے مسافر کو ہر ایک نامعلوم دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے، اور مجھے بھی آخر میں اپنی عبادت گاہ تک پہنچنے کے لئے بیرونی دنیا میں بھٹکنا پڑتا ہے۔

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

بانگ درا

یہ کور نگاہی، یہ ناواقفیت، یہ بے خبری ٹیگور ہی کے حصے میں آتی ہے، ورنہ ایسا جہاں بین شخص یہ بچپنے کی سی باتیں نہ کرتا۔ اقبالؒ نے اشارۃً ڈھونڈنے والوں سے کہہ دیا ہے کہ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ تم خود ہی ہو۔ تم آپ اپنی منزل ہو، صرف نگاہِ قلب درکار ہے

د: آنکھیں بند کرنے سے پہلے دور دور میری نگاہیں بھٹکتی رہی ہیں اور میں نے کہا کہاں ہو تم؟ تم کہاں؟ کی پکار آنسوؤں کے ہزاروں نالوں میں بہہ گئی اور دنیا میں ہوں کے سیلاب میں غرق ہو گئی۔

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

۱۲۔ الف: جو گیت گانے آیا تھا وہ اب تک نہ گا پایا۔
ساز کے تار درست کرنے میں ہی سارے
دن گذار دیئے۔ اب تال ٹھیک نہیں بیٹھی
اب شبد نہیں جچے اور دل میں صرف
گانے کی دکھی تمنا باقی رہ گئی۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں!
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

ارمغانِ حجاز

اقبال نے اس سارے واویلے کا جواب ایک سطر میں دے دیا ہے کہ ؎
"خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟"
ٹیگور نے بد قسمتی سے اس مذہب اور ماحول میں آنکھ کھولی تھی جہاں اسلام کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ پھر وہ خود مسلمان یا اس کی خودی مسلمان کیونکر ہو سکتی تھی! بس یہی کوتاہی کی وجہ ہے۔ کہ ٹیگور زندگی کے ہر مقام پر بھٹکتا ہوا نظر آتا ہے۔

ب: کلی کھل نہیں پائی۔ صرف ہوا ہی قریب آ کر ٹھنڈی سانس بھر رہی ہے۔

کلی گل گی ہے محتاجِ کشود آج
نسیمِ صبحِ فردا پر نظر کیا؟

کلی سے دل کو تشبیہہ دی گئی ہے ٹیگور کا غنچۂ دل وا نہ ہوا اسلیئے کہ وہ محتاجِ کشود رہا۔

ج: مَیں نے اُن کے نہ تو نیاز حاصل کئے ہیں
اور نہ آواز ہی سُنی ہے۔ صرف مَیں
تو اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر
قدموں کی آہٹ سُن پاتا ہُوں۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردے میں نہیں ہے نگہِ پاک

ارمغانِ حجاز

ج: سارا دن تو انکی تشریف آوری کی خاطر
فرش بچھانے میں ہی گذر گیا۔ ابھی تک
مَیں چراغ بھی روشن نہیں کرسکا۔ تو انہیں
کیسے گھر پہ بلاؤں؟ ملاقات کی امید
میں ہی زندہ ہوں، لیکن ابھی تک
ملاقات نصیب نہیں ہوئی۔

مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تُو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

ارمغانِ حجاز

۱۴۔ الف: پکار میری درد بھری، اور میری تمنائیں بے شمار ہیں لیکن تُو نے مجھے ہمیشہ ہی کڑی ٹھوکروں سے بچایا ہے، یہی تمہاری انتہائی عنایت میری رگ رگ میں جذب ہو گئی۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں!

بالِ جبریل

ٹیگور اس چیز کا احسان مند ہے کہ خُدا نے اُسے ٹھوکروں سے بچائے رکھا ہے حالانکہ ٹھوکریں ہی انسان کو تجرباتِ زندگی سے روشناس کرتی ہیں۔

ب۔ دن بدن تم مجھے اپنے سید ھے سادے لیکن بہت اونچی بھلائی کے قابل بنا رہے ہو بغیر مانگے ہی یہ آسمان، یہ روشنی، جسم زندگی اور دل عنایت فرما کر تمناؤں کے جھنجال سے آزاد کرتے رہتے ہو۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تُو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ھُو

بالِ جبریل

انہیں شبہ نہیں کہ یہ دُنیا کی نعمتیں انسان کیلئے اللہ کی طرف سے عنایات ہیں لیکن انسان کو انہیں پر قناعت نہیں کرنا چاہیے یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں لیکن ٹیگور کے نزدیک یہی منشائے آرزو ہیں۔ گویا انکے بعد اور انکے علاوہ کسی تمنا کا وجود ہی نہیں ہے

ٹ: کبھی کبھی تھک کر اور سست ہو کر میں پیچھے رہ جاتا ہوں اور کبھی کبھی بیدار ہو کر اپنے مقصد کی طرف لپکتا ہوں۔ لیکن تو ایسا بیدرد ہے کہ مجھ سے چھپا ہی رہتا ہے۔

ا خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلّی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ارمغانِ حجاز

ٹ: دن بدن ہمیشہ ہی ٹھکرا کر چھوٹی اور چنچل تمناؤں کے جھنجال سے چھڑا کر تم مجھے ہی بلند کرم کے لائق بنا رہے ہو۔

ا حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو!
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

بالِ جبریل

ٹیگور اس دنیا سے الگ ہو کر رہبانیت کو ترجیح دیتا ہے اور اس کے نزدیک یہی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ وہ انسان کو گوشہ نشینی کا مرتبہ عطا فرما دے۔ لیکن یہ تخیّل اقبالؒ کے نزدیک سراپا حجاب ہے۔

۱۵- الف:۔ نہایت چھوٹی جگہ کا رہنے والا آج تمہارے عالیشان محل میں گیت سنانے آیا ہے۔ کم از کم میرے گیت تو سن لے۔

؎ اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد!
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد!
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد
"بالِ جبریل"

ٹیگور ہر مقام پر مرتبۂ انسان اور وقارِ بشریت کو گرا رہا ہے۔ چنانچہ اس جگہ پر بھی اپنے تئیں نہایت چھوٹی جگہ کا رہنے والا کہتا ہے اور پھر خدا سے گڑ گڑا کر ملتجی ہوتا ہے لیکن اقبالؒ التجا کے ساتھ ساتھ طعنہ زن بھی ہے اور حقیقتوں کو بے نقاب بھی کئے جا رہا ہے اور انسان کا مقام فرشتوں سے کہیں بلند بتا رہا ہے۔

ب:۔ تمہاری دنیا میں مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ میری اس فضول زندگی سے بے مطلب نغمے کی سُر ہی نکلتی ہے۔

؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا
؎ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے
"بانگِ درا"

ٹیگور کے نزدیک انسان کا دنیا میں آنے سے مدعا ہی کچھ نہیں ہے، اور وہ انمول اور بیحد قیمتی زندگی کو فضول سمجھتا ہے اور زندگی کی سانس کو بے مطلب نغمے۔ افسوس کہ ٹیگور کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین، کوئی مقصد، کوئی مدعائے حیات ہی نہیں ہے، حالانکہ بقول اقبالؒ انسان ہر وقت عرصۂ محشر میں رہتا ہے اور اس کے سامنے ایک خاص نصب العین ہوتا ہے اور وہ نصب العین بھی نہایت مقدس، نہایت بلند اور نہایت محترم ہے۔ کہ انسان کو دنیا کا امام بن کر رہنا ہے اور یہ کوئی معمولی بوجھ یا کھیل تماشہ نہیں ہے۔

ج۔ نصف شب جب مندر میں پوجا کے لئے گھنٹے بجیں، تب اے میرے مالک! مجھے اپنے سامنے گانے کی اجازت دینا۔

"تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر"
"بالِ جبریل"

ٹیگور اپنے معبود کی عبادت کے لئے معبود ہی سے اجازت طلب ہے۔ حالانکہ یہ وہ مقام ہے جہاں دل کو شوق، اور شوق کو دل سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ اسی لیے ذوقِ عبادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ ایسی نماز اور ایسے ذوق نماز سے الگ ہی رہ تو اچھا ہے جس میں سرور اور ذوق نہ ہو۔

ح۔ جب نسیمِ صبح میں سنہری سُر نکلیں اس وقت مجھے اپنے حضور میں حاضر ہونے کا شرف بخش کر مشکور فرمانا۔

"عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحزَنُون کر
خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر"
"بالِ جبریل"

ٹیگور اپنے خدا سے ملتجی ہے کہ مجھے علی الصبح عبادت میں شریک ہو جانے کا شرف عطا فرمانا، کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ٹیگور کے سینے میں وہ حرارت موجود نہیں ہے جس کی گرمی سے عبادت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور پھر یہ دُعا بھی کیا دعا ہے۔ دُعا تو بقولِ اقبالؒ یہ ہے کہ "مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر" کیونکہ صاحبِ جنوں خود وقت کو بیدار کرتا ہے، وقت اُسے بیدار نہیں کرتا۔

۱۶۔ الف:۔ دنیا کے اس میلے کی دعوت پاکر میری زندگی کا انجام بخیر ہوا۔ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا

ب: عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
"بالِ جبریل"

ٹیگور کا مطالعۂ عالم اس نتیجہ تک پہنچ سکا کہ یہ دنیا ناپائیدار اور فانی ہے، اور انہی مشاہدات کو نگاہِ خرد سے دیکھا اور دنیا کی زبان سے اس کا واویلا سنا لیکن اقبالؒ کے نزدیک یہ سب غلط اور بے حقیقت اندازے ہیں، کیونکہ اپنے آپ کو فانی سمجھ لینے سے انجام بخیر نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو یہ تصوّر ہی ایک بنیادی غلطی ہے انسان فنا نہیں ہوتا جسم فنا ہوتا ہے۔

ج:۔ اس میلے میں اپنا ساز بجانا میرا فرض تھا جو میں نے اپنی ہمت کے مطابق نبھایا اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں جا کر تمہارے درشن کر پاؤں اور اپنا خاموش سلام پیش کر دوں

د: جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے!
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
"بالِ جبریل"

دنیا میں ٹیگور کے ہم خیالوں کی بھی کمی نہیں ہے اور انہی لوگوں کے لئے جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن نہیں دیکھتے، اقبالؒ نے اللہ سے التجا فرمائی ہے کہ:۔

"مرا نورِ بصیرت عام کر دے"

الف: اب تو میں خود کو پیش کرنے کے لئے
صرف تمہارے پیار کا منتظر ہوں۔ اس
واسطے تو اتنا وقت ہوگیا ہے، اور
اسی واسطے تو اس قدر غلطیاں میرے
سر ہیں۔ میں اُس باغ میں آیا چاہتا
ہوں، جہاں خزاں نہ ہو۔

وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دُور نہیں
بالِ جبریل

ٹیگور نے سمجھا ہے کہ وہ مقامِ اماں جسے جنّت کے نام سے پکارا جاتا ہے، صرف مرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور یہی ٹیگور کی خامیٔ ادراک کی دلیل ہے کیونکہ صاحبِ نظر اقبال کے نزدیک، وہ مقام انسان کی سعیٔ عمل سے زیادہ دُور نہیں ہے۔

ب: لوگوں کے اس قانونِ عالم کو ہمیشہ ٹالتا ہی
رہتا ہوں۔ اب تو میں اپنے آپ کو تمہارے
سپرد کرنے کیلئے تمہاری محبت کا منتظر ہوں۔

تُو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دُور نہیں!
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دُور نہیں
بالِ جبریل

ج: لوگ مجھ پر الزام لگاتے ہیں اور غافل
کہتے ہیں اور ٹھیک ہی تو ہے۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
نگاہِ شوق میسّر نہیں اگر تجھکو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی
بالِ جبریل

ٹ: کاروبار کا دن ختم ہو گیا اور کام کرنے والوں کا کام بھی۔ جو لوگ مجھے بلانے آئے تھے، وہ نا امید اور ناراض ہو کر چلے گئے۔ اب تو میں اپنے آپ کو تمہارے سپرد کرنے کے لئے صرف تمہاری محبّت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

۵
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر!
بالِ جبریل

ایک ٹیگور ہے کہ بزمِ جہاں سے نہایت جلد رخصت ہونا چاہتا ہے اور ایک اقبال ہے کہ اپنے عاشق کو غمِ فرقت سے بیتاب رکھنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اُس کے احساسات پر ایک ضرب بھی لگا رہا ہے۔

الف: گھنگھور بادل چھائے جا رہے ہیں اور تاریکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے، اے محبوب! تو نے مجھے باہر دروازے پر تنہا کیوں بٹھا رکھا ہے؟ دوپہر کو تو میں کام کاج میں منہمک رہتا ہوں لیکن اس وقت اس تاریکی میں تو صرف تمہارے ہی سہارے ہوں۔

فکر بے نور ترا جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات!
بالِ جبریل

ٹیگور کی زندگی پہ تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں، اور وہ اس لئے کہ اس کا فکر بے نور ہے اور وہ خود صاحبِ نظر نہیں ہے۔

ب: اگر تم اپنے درشن نہ دوگے یا مجھے الکدم ہی ترک کر دوگے تو میں بارش کی یہ لمبی اور کٹھن گھڑیاں کیسے گذاروں گا؟

ج: دور آسمان کے اندھیرے میں اپنی نگاہ جمائے ہوئے ہوں اور میرا دل چنچل ہوا کے ساتھ روتا ہوا بھٹک رہا ہے۔

نگاہ ایک تجلّی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلّی تلافیٔ مافات
ارمغانِ حجاز

مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
ارمغانِ حجاز

ٹیگور آسمان پر امید کی نظریں جمائے بیٹھا ہے اور جب تھک کر مایوس ہو جاتا ہے تو رونے لگ جاتا ہے لیکن اقبال کہتا ہے کہ جس آسمان، چاند سورج اور ستاروں کو تو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا ہے تو ان پر اپنی کمندیں کیوں نہیں ڈالتا؟ انہیں تسخیر کیوں نہیں کرتا؟ اور انہیں اپنا محکوم کیوں نہیں بنا لیتا؟ اگر تجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے تو سمجھ لے کہ تیرا اندرون جذبِ خودی سے خالی ہے اور یہ خلا کافری ہے اور کافری آدمی کو اسکے مقام سے بہت دور رکھتی ہے۔

۱۹۔ الف: اگر تم نہیں بولو گے تو میں اپنا دل تمہاری خاموشی سے ہی لبریز کر کے چپ چاپ برداشت کر دوں گا۔ تاروں بھری رات کی مانند صبر سے سر جھکائے میں تمہارا ہی انتظار کرتا رہوں گا۔

نگاہ پیدا اگر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

بال جبریل

اقبال کی نگاہ میں ہر ذرہ نورِ خدا کا شاہد ہے اور ہر لہر دریا کا جزو ہے۔ اور دریا اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ اپنی موجوں سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ٹیگور اپنی اصلیت سے قطعی بیگانہ اور بے خبر ہے۔

ب: صبح یقیناً نمودار ہوگی اور سیاہی غائب ہوگی، اور تمہاری آواز کی سنہری نے فلک کو پاش پاش کر دے گی اور زمین پر اتر آئے گی تب پرندوں کے آشیانوں میں سے تمہارے الفاظ گیت بن کر اڑیں گے اور تمام صحنِ چمن میں تمہارے میٹھے راگ پھول بن کر کھلیں گے۔

اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا
پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑی ہو کر
چٹک او غنچۂ گل تو مؤذن ہے گلستاں کا

بانگِ درا

جس مردِ مومن کا اندرون نورِ خودی سے منور ہے۔ اس کی زندگی میں کبھی شبِ تاریک آتی ہی نہیں۔ یہ رات اور یہ دن جو گردشِ لیل و نہار کے محتاج ہیں۔ ایک مستقل حکم کے تابع ہیں۔ انسان ان کے ماتحت زندگی کو مجبور و معذور نہیں رکھ سکتا۔ یہ مادی کائنات تو پرندوں وغیرہ کے لئے ہے جو رات کی سیاہی کو نور میں بدلنے سے عاجز ہیں۔ اور اپنی لامحدود فطرت کے زیرِ اثر سورج کی پہلی شعاع کے ساتھ شاخوں پر آجاتے ہیں۔ اگر یہی دستورِ حیات انسان اختیار کر لے تو پھر ان میں اور مقامِ بشر میں امتیاز کیا رہا؟

۲. الف: جس دن کنول کھلا۔ ہائے اُس دن میرا غنچہ دل بھٹکتا ہی رہا اور مجھے اس کا پتہ بھی نہ چلا ٹوکری میری خالی پڑی تھی۔ لیکن پھولوں کی طرف میرا خیال ہی نہ گیا۔

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی!
ضربِ کلیم

ب: کبھی کبھی میرا دل اُداس ہو اٹھتا تھا میں اپنے خواب سے چونک پڑتا تھا، اور اُس وقت شمالی ہوا میں عجیب سی خوشبو کا اثر ہوتا تھا۔

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
"بالِ جبریل"

ٹیگور نے مناظرِ فطرت کے مطالعہ سے بھی وہ لطف نہ اٹھایا جو ایک صاحبِ نظر اٹھاتا ہے اُس کی نگاہ رنگ و بُو میں اُلجھ کر رہ گئی۔ اور حقائق کے پردے چاک نہ کرسکی۔

ج: اس میٹھی بُو نے میرے دل میں سوزِ تلاش پیدا کر دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بسنت کی ہوا اپنے انجام کی ہوا میں سرگرداں ہو۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی،
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
بالِ جبریل

ٹیگور کے دل میں مناظرِ قدرت کی دلکشی کے اثر نے صرف سوزِ تلاش پیدا کیا۔ لیکن اقبال نے اس سے یہ پیغام حاصل کیا کہ جن کا اندرون سوزِ خودی سے سرگرم ہے ان کا مقام بادشاہی ہے

د: تب مجھے معلوم نہ تھا کہ انجام میرا اس قدر نزدیک ہے، اور میری ہی روح میں شگفتگی حاصل کر رہا ہے۔

مذاقِ دید سے ناآشنا نظر ہے تری
تری نگاہ نہیں فطرت کی رازداں پھر کیا؟
بانگِ درا

(۱) الف: مجھے اب تو اپنی کشتی دریا میں اُتار ہی دینی چاہیئے اوہ کنارے پر کھڑے کھڑے غفلت میں میرا وقت ختم ہوا جا رہا ہے۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود (بالِ جبریل)

ٹیگور کہتا ہے کہ مجھے کاروبارِ عالم میں اپنے آپ کو مشغول کر لینا چاہیئے کیونکہ ارادوں کی کشمکش میں فضول وقت گوار رہا ہوں لیکن اقبال کہتا ہے کہ جس دنیا کو تو پسند کر رہا ہے اور اس کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے وُہ تو ایک مقامِ طلسم ہے اس طلسم کے آگے اور بھی جہان ہیں جو تیری نگاہ سے پوشیدہ ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کر کیونکہ یہ عالمِ رنگ و بُو انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

ب۔ موسم پھولوں کو کھلا کر چلا بھی گیا اور اب مرجھائے ہوئے پھولوں کا ہار لیئے چپ چاپ کھڑا ہوں، بلبلیں شور مچا رہی ہیں اور کنارے کے تاریک راستے پر زرد پتے مرمر کی آواز سے گر رہے ہیں۔

یہ پریشانی میری سامانِ جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی میری سرمایۂ قوت نہ ہو (بانگِ درا)

ج۔ آہ اس سنسان عالم میں کیا جھانک رہے ہو تم، کیا تم ہو لیں پٹی ہوئی سرسراہٹ کو محسوس نہیں کرتے۔ جو سامنے کے کنارے سے سریلی تان میں بہہ رہی ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں (بالِ جبریل)

ٹیگور مست ہواؤں میں صرف سُریلی تان سُن رہا ہے اور خود اس پر غالب آ رہی ہے لیکن اقبال کے نزدیک فطرت کے یہ تمام مناظر انسان کے لئے ہیں۔ اور انسان فاتح کی حیثیت سے ہے ان کے تاثرات سے مغلوب ہو جانا بشر کی شانِ امتیازی کے خلاف ہے۔

۲۲ الف: برسنے ساون کے گھنے اندھیرے میں رات کی خاموشی دبے پاؤں اٹھی اور تم تمام پہرہ داروں سے بچ نکلتے ہو، میری رات کو بھی منور کر دو۔

ب۔ مشرقی تند ہوا کے جھونکوں کی حرمت کر کے افق نے آج اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور ہمیشہ کے لئے بیدار آسمان پر بھی موٹی تہ جم گئی ہے اور کہیں کہیں نور چمک رہا ہے

ج۔ ہوا نے نغمہ بند کر دیا ہے اور تمام مکانوں کے دروازے بھی بند ہیں۔ رونقِ آدم سے محروم راستے پر تمہیں اکیلے مسافر ہو اے میرے اکیلے دوست میرے محبوب میرے گھر کے دروازے کھلے ہیں، خواب کی طرح آ کر کہیں چلے نہ جانا

تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ!
میرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی
(بالِ جبریل)

محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے (بانگِ درا)
فطرت بیہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا (بانگِ درا)

۲۳۔ الف اے دوست! اس قیامت کی رات میں محبت کا سفر کرنے کے لئے تنہا ہی نکلے ہو کیا! آسمان بھی تو ہارے ہوئے انسان کی طرح مضطرب ہے۔ میں بھی جدائی کی راتوں کو فریب دے لیتا ہوں۔

یونہی میں دل کو پیامِ شکیب دیتا ہوں
شبِ فراق کو گویا فریب دیتا ہوں
(بانگِ درا)

ب آج مجھے نیند نہیں آتی، رہ رہ کر بار بار دروازہ کھولتا ہوں کہ گھپ اندھیرے میں باہر جھانکتا ہوں مگر کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔ میں حیران ہوں کہ تمہارا راستہ کدھر ہے؟

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں
یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں
سکوتِ شامِ جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے
(بانگِ درا)

ٹیگور اپنے محبوب و معبود کے نیاز کے لئے کبھی اپنے اندر اُسے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا جب بھی دیکھتا ہے اُسے بیرونی نظاروں میں دیکھتا ہے حالانکہ اُس کا ٹھیک مقام انسان ہی کے اندر درخشاں و خنداں ہے

ج پیارے دوست! ندی کے کونسے سبز آلود کنارے اور بھیانک جنگل کی کونسی منزل اور تاریکی کے کس مشکل راستے سے تم میرے پاس آنے کی راہ بنا رہے ہو!

شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال
دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
(بانگِ درا)

ٹیگور پھر ندی کے بہتے ہوئے پانی، جنگلی بھیانک مناظر اور رات کی تاریکیوں میں کھو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید انہیں مقامات پہ ربِ قدوس کا مسکن مل جائے گا لیکن اقبال بار بار کہتا ہے کہ اے متلاشی اُسے اپنے ہی اندر تلاش کر بلکہ خود کو وہ سمجھ جس کی تجھے جستجو ہے کیونکہ تو اس سے اور وہ تجھ سے ہرگز بیگانہ نہیں ہے ندی نالوں کی بجائے اپنے قلب کے اُبلتے ہوئے چشموں کو دیکھ۔

۲۴ الف۔ یا کہ دن بہت بیت گیا ہے یا پرندوں نے نغمے بند کر دیئے ہیں ہوا تھک کر سست رفتار ہو گئی ہے۔ تب مجھ پر بھی تاریکی کا سیاہ پردہ ڈال دو جیسا کہ تم نے زمین پر نیند کا پردہ ڈال دیا ہے اور جیسا کہ شام کو مرجھائے ہوئے کنول کی پنکھڑیوں کو نرمی سے بند کر دیا ہے۔

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تُو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تُو
(بانگ درا)

ٹیگور اس مسلسل گردشِ لیل و نہار سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے جیسا کہ مشاہدہ کی دوسری مادہ دنیا ہے وہ سکوتِ شام کے ساتھ خود بھی خاموش ہو جانا چاہتا ہے لیکن اقبال اس کے برعکس لب کشائی کی تاکید کرتا ہے اور انسان کو بربطِ عالم کے خطاب سے مخاطب کرتا ہے۔

ب۔ وہ مسافر جس کی منزل ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکی ہو۔ کپڑے تمام چیتھڑے چیتھڑے اور خاک آلود ہو گئے ہیں اور استقلال تھک کر بیٹھ گیا ہے۔

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تُو گلشن میں مثلِ جو ہوا
پھر کہیں سے پیدا کر اس کو بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
(بانگِ درا)

ج۔ غریبی کے حجاب کو مجھ سے لے لو میرے خدا! اور اپنی اس محبت بھری رات میں جس میں کلیاں غنچے بن کر چٹکتی ہیں مجھے بھی شگفتگیِ حیات عطا فرما۔

وا غِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
(بانگِ درا)

کبھی تو ٹیگور کہتا ہے کہ خدا کا مقام ہی غریبوں کی بستی میں ہے اور کبھی اُسی غریبی کو واپس دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ مفلسی کی لعنت کی حدوں کو گزار کر فطرت کی آزاد ہوا اور فضا میں سانس لوں۔

۲۵۔ الف۔ تھکی ہوئی راتوں میں نیند کے آنچل تلے مجھے اپنا سہارا دے کر سو لینے دے۔

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر (بانگِ درا)

ٹیگور رات کو تھکی ہوئی محسوس کرتا ہے اور خدا سے ملتجی ہے کہ اس پر مدہوشی کا پردہ ڈال دو لیکن اقبال خدا سے کہتا ہے کہ انہی راتوں میں خود تماشا بن اور محفلِ مہ و انجم کو تماشائی کر تاکہ ان خاموشیوں میں بھی ایک حشر برپا رہے۔

ب۔ میری طاقت تھک کر سست ہو گئی ہے اس لئے مجھے تم اپنی عبادت کی ادھوری تیاری میں نہ لگاؤ۔

سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی (بانگِ درا)

خدا کے حضور میں انسان کا یہ عذر پیش کرنا کہ اس کی ہمتیں تھک گئی ہیں کس قدر باعثِ ندامت ہے اقبال کہتا ہے کہ مسلسل کوششیں ہی زندگی کا ترازو ہیں اقبال کی نگاہ میں وہ انسان ہی نہیں جو حصولِ منزل سے پہلے ہی سرِ منزل تھک کر بیٹھ جائے۔

ج۔ دن کی تھکی ہوئی آنکھوں پر رات کا پردہ ڈال دیتے ہو تاکہ انہیں نورِ سحر دیکھنے کی قوتِ بینائی حاصل ہو۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند سے ہی زندگی کی مستی ہے (بانگِ درا)

اس فلسفۂ موت و حیات پر دونوں چوٹی کے فلاسفر ہم خیال نہیں گیتانجلی میں کہیں کہیں ٹیگور کے اس انداز کے تخیل کی جھلک نظر آجاتی ہے جس سے طالب علم کو قدرے مسرت مل جاتی ہے۔

۲۶۔ الف۔ وُہ آئے اور آکر میری بغل میں بیٹھ گئے لیکن میں سوتا ہی رہا مجھ بدنصیب کی یہ کیسی بدبخت نیند تھی۔

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے
کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر (ضربِ کلیم)

کیا اُس عاشق کو عاشق کہا جا سکتا ہے جس کی یہ کیفیت ہو کہ اُس کا محبوب تو ہم آغوش ہو اور وُہ غفلت میں سویا خراٹے بھر رہا ہے۔ کیا یہ نہایت بدذوقی کی دلیل نہیں ہے۔

ب۔ ہاتھوں میں بینا لیئے وُہ نیم شب آئے۔ بین کے میٹھے سُروں سے میرا خواب بھی لہرا اٹھا۔ ہائے میری سبھی راتیں اسی طرح گذر رہی ہیں۔ جن کی سانس میرے سپنوں تک پہنچ جاتی ہے اور مجھے کبھی بھی اُن کے درشن نصیب نہیں ہوتے۔

ہے ذوقِ نمود زندگی کی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی (بالِ جبریل)

ٹیگور اس عالمِ رنگ و بُو ہی میں بھٹکتا رہا لیکن یہاں بھی اُسے مقصودِ جستجو نظر نہ آیا اور وُہ اس لئے کہ ٹیگور کا اندرون نورِ خودی سے قطعی خالی ہے۔ اِس مقدس روشنی سے اُس کی شبِ دیجور میں کبھی روشنی نہیں پہنچی۔ اُس کی راتیں سحر میں تبدیل نہ ہوئیں اور اُس کی تمام زندگی اندھیرے ہی میں کٹ گئی جس کا وُہ خود اعتراف کرتا ہے۔ اور زندگی بجائے خود موت ہے۔ پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ٹیگور کے پرستاروں نے اُسے کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جو دنیا نے اُسے اسی تصنیف (گیتانجلی) پر عزت کا انعام عطا فرما دیا اور ہندو قوم نے اُسے آسمانِ شہرت پر بٹھا دیا۔

۲۷۔ الف: روشنی! ارے کہاں ہے روشنی؟

اسے حسرتوں کی آگ میں جلا کر منور کر دو
یہ چراغ تو ہے لیکن اس میں کبھی لَو ہی
نہ اٹھی۔ آہ میرے دل! کیا تمہاری
قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اس سے تو
موت ہی بہتر تھی۔

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسّم ہائے پنہانی!

ارمغانِ حجاز

ٹیگور کی ساری عمر اندھیرے میں ہی نُورِ مقدّس کی جستجو میں گذر گئی، لیکن اُسے ایک شعاع اور شعاع کی ہلکی سی جھلک بھی تو نصیب نہ ہوئی اور وہ اسلئے کہ وہ دیدۂ بینا وا نہ کر سکا۔

ب: دُکھ تیرا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، وہ
پیغام لایا ہے کہ تیرا مالک بیدار ہے اور
تجھے اس تاریکی میں محبّت کی شطرنج
کھیلنے کے لئے بلا رہا ہے۔

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستُور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عُریانی

ارمغانِ حجاز

ج: آسمان پر گھنے بادل چھائے ہیں، اور
موسلا دھار بارش ہو رہی ہے عجیب
سا اضطراب میری دنیا میں مچا ہوا
ہے۔ میں اسے سمجھ نہیں پاتا ہوں۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا اِلٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و ماہ سے

ارمغانِ حجاز

نورِ لا الٰہ سے منوّر اور تاباں عالم کو تو نگاہِ
مومن ہی دیکھ سکتی ہے وہ نظر جو آواگون
کے ادراکی منطق میں اُلجھی ہوئی ہو بھلا اُس
مقامِ بے حجاب تک کیونکر پہنچ سکتی ہے ؟ ۔

۵: بجلی کی چمک میری آنکھوں کو چندھیا دیتی
ہے، اور میرا دل اس راستے کو ٹٹولنے
لگتا ہے، جہاں رات کا نغمہ مجھے دعوت
دیتا ہے ۔

حدیثِ بندۂ مومن دل آویز
جگر پُرخوں، نفس روشن، نگہ تیز

ارمغانِ حجاز

مومن کی نگاہیں اس برقِ فانی سے نہیں
چندھیا سکتیں ۔ اس کا اثر تو نگاہِ کفر پر ہی
پڑ سکتا ہے جو خود منوّر نہیں ہے، اور
روشنی میں رہنے کی عادی نہیں ہے ۔

۴: روشنی ؟ کہاں ہے روشنی ؟ اسے ان
حسرتوں کی آگ میں جلاکر منوّر کر دو ۔ بادل
گرج رہے ہیں سنسان آسمان سے ہوا
چلاتی ہوئی آ رہی ہے ۔ رات سیاہ تاریک
فضا میں ڈوب گئی ہے ۔

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی

ارمغانِ حجاز

ٹیگور روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہے
اُسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا
دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ بقولِ اقبالؒ
ہر شے منوّر اور یہ عالم خود ایک نور ہے۔

ل: یہ وقت تاریکی میں ہی نہ گذر جائے ۵
اسے اپنے جیون سے شعلۂ محبت کو اور
بھی منوّر کر دو۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
تُو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟

ارمغانِ حجاز

۲۸۔ الف: میں مضبوط بندھنوں سے جکڑا ہوا ہوں، لیکن جب میں انہیں توڑنے کی کوشش کرتا ہوں تب میرے دل میں ٹیس اٹھتی ہے۔

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
بانگِ درا

• ایک طرف تو ٹیگور دنیاوی آلائشوں سے الگ ہوتے ہوئے دُکھ محسوس کرتا ہے، اور دوسری طرف ان شورشوں سے نجات کا طالب ہے۔

• لیکن اقبالؒ اسی بھنور اور طوفان میں رہ کر خوش ہے کیونکہ تھپیڑوں سے وہ زندگی حاصل کرتا ہے۔

ب: میں صرف نجات چاہتا ہوں، لیکن اس کی تمنّا سے ہی شرم محسوس ہوتی ہے، مجھے یقین ہے کہ تم شاہی خزانوں کے مالک ہو، اور تم میرے سب سے زیادہ محبوب دوست بھی ہو، لیکن اپنے کمرے میں سے فضول ڈھونگ ہٹا دینے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے انساں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
بانگِ درا

• ٹیگور میں نہ قوّتِ حیدری، نہ شانِ قلندری ہے، وہ ان دونوں نعمتوں سے محروم ہے، نہ تو اُن چیزوں سے الگ ہو سکتا ہے جنہیں وہ خود فضول ڈھونگ سے تشبیہ دیتا ہے اور نہ ہی اُن میں رہ کر مرتبۂ انسانیت حاصل کر سکتا ہے حالانکہ انسان از خود سبھی کچھ ہے۔

۷: مٹی اور موت کے نقاب سے جسے میں اوڑھے ہوں، نفرت کرتا ہوں، لیکن محبت سے اس چادر کو لپیٹے رہتا ہوں۔

۷ خاک میں تجھکو ملایا ہے مقدر نے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
بانگِ درا

ٹیگور کا مزاج بھی عجیب ہے، اور عجیب ہی اس میں بچپن ہے۔ خود ہی اپنے فانی جسم سے نفرت کرتا ہے اور خود ہی اسے محبت سے لپیٹے ہوئے بھی ہے، یہ تو کسی صاحبِ شعور کا عمل نہیں ہے۔

۸: میں مقروض بھی ہوں اور ناکام بھی حجاب غیر محسوس سے دبا پڑا ہوں، اور پھر بھی اپنی اچھی تمناؤں کی دعا کرنے آتا ہوں تو ڈر سے کانپنے لگتا ہوں کہ کہیں میری دعا نامنظور نہ ہو جائے۔

۸ ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
بانگِ درا

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقین اللہ مستی، خود گزینی!

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار!
غلامی سے بتر ہے بے یقینی!
بالِ جبریل

۲۹ الف۔ وُہ جسے میں نے اپنے نام سے سجا رکھا ہے اس قید خانہ کے اندھیرے رو رہا ہوں۔ چاروں طرف سے میں اُس کی دیوار تعمیر کرنے میں مشغول رہتا ہوں اور جُوں جُوں یہ دیوار بلند ہوتی جاتی ہے اس کی اندھیری چھایا میں میری اصل حقیقت آنکھوں سے غائب ہوتی جاتی ہے۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
بانگِ درا

مانا کہ انسان اپنے جسمِ خاکی سے مانوس و ہم کنار ہو کر اپنی حقیقت سے بے خبر ہو جاتا ہے جیسا کہ ٹیگور کہتا ہے لیکن یہ خطا کس کی ہے؟ انسان کا مقام تو یہ ہے کہ ہر شے اور ہر شے کی زنگت اُس کے آئینۂ ہستی میں پنہاں ہے۔ انسان کسی مقام پر بھی اِس عالمِ رنگ و بُو میں گم نہیں ہے۔

ب۔ بڑے غرور کے ساتھ میں اِس دیوار کو تعمیر کرتا ہوں۔ میں اس پر مٹی اور ریت کا پلاسٹر چڑھا رہا ہوں تاکہ اس میں کوئی سوراخ نہ رہ جائے اس محویت کے عالم میں میں اپنی حقیقت کو بھولتا جا رہا ہوں۔

تجلّی خود بخود کو تمنّا جن کے نظّاروں کی تھی
وُہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

انسان کا مقام اس قدر بلند و بزرگ ہے کہ فرشتے اس کے حضور میں سربسجود ہوتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور فطرت کی تجلّیات متمنّی ہیں کہ کبھی اُنہیں بشر کا جلوہ نصیب ہو لیکن ٹیگور بہ حیثیت انسان کے اپنی حقیقت کو بھی بھول رہا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اُس کا ماحول قرآنی نہیں اُس کی نگاہ کے سامنے قرآن نہیں۔ اور اُس کا اعتقاد قرآن پر نہیں رہا ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ اُس کا قلب اُس کا ذہن اُس کا فہم سب کے سب اُکھڑے ہوئے ہیں۔

۳۔ الف۔ تاروں کی چھاؤں میں میں مقامِ وصال کی طرف تمہارے درشن کے لئے تنہا نکلا تھا مگر اس گھنگھور اندھیرے میں یہ کون سا سایہ میرے پیچھے لگا آ رہا ہے میں اس سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر ہٹتا ہوں مگر وہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔

سینہ ہے ترا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے بانگِ درا

ایک ہی منظر کو ٹیگور تاروں کی نورانی چھاؤں بیان کرتا ہے اور اُسی مشاہدہ کو گھنگھور اندھیرا بتاتا ہے اور پھر اپنے ہی سائے کی پہچان بھی نہیں کر سکتا ہے۔ سایہ تبھی ہوتا ہے جب فضا میں روشنی ہو لیکن روشنی اُسے نظر ہی نہیں آتی حالانکہ ہر مقام پر ہر شے میں نورِ خدا نمایاں و درخشاں ہے۔

ب۔ وہ اپنی وحشیانہ چال سے دھواں اڑاتا ہوا چلا آ رہا ہے میرے ہر ایک لفظ کے ساتھ وہ اپنا سنگدل بول بولتا ہے

ج۔ اے خدا یہ تو میرا ہی ننھا عکس ہے اسے تو ذرا بھی شرم نہیں مگر اس کے ساتھ آتے ہوئے تمہارے حضور میں مجھے حیا آتی ہے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو بانگِ درا

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری بالِ جبریل

ٹیگور اپنے اعمالِ زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زندگی اپنے ہی اعمال سے ایسی مکدر بن چکی ہے کہ اُسے تیرے حضور میں لاتے ہوئے حیا آتی ہے لیکن اقبال اُس کے فضل و کرم سے ناامید نہیں ہوتا اور سعیِ عملِ پیہم کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ اس سعیِ پیہم سے انسان کا اندرون تاریک ہے منور ہوتا ہے۔

۳۱- الف: قیدی! تمہیں کس نے باندھ رکھا ہے؟ میرے

خدا نے، قیدی نے جواب دیا۔ میں نے سوچا تھا

کہ اس دنیا میں دولت اور طاقت اکٹھا کر کے

سب کو شکست دیدوں، اس لیے جو دولت

مجھے اپنے خدا پر نچھاور کرنا چاہیئے تھی، اسے

بھی میں نے اپنے خزانے میں رکھ لیا، اور

نیند آنے پر مالک کے شبستاں پر سو رہا لیکن

جب جاگا تو اپنے آپکو اپنے ہی خزانے میں

قید پایا۔

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

بانگِ درا

ٹیگور کہتا ہے کہ جب مَیں جاگا تو معلوم ہؤا کہ اپنے ہی اعمالِ زندگی کی زنجیروں میں پابند پڑا ہے۔ لیکن ٹیگور کی زندگی کے مطالعہ سے تو کسی مقام پر معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے قلب میں نور اور نگاہوں میں بصیرت آگئی تھی، کیونکہ شروع سے آخر تک وہ تاریکیوں میں ہی بھٹکتا نظر آتا ہے۔

ب: قیدی! یہ نہ ٹوٹنے والی بیڑیاں کس نے

بنائیں؟ میں نے ہی، قیدی نے جواب

دیا، میں نے ہی بڑی ہوشیاری سے

انہیں بنایا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں

اپنی وہ طاقت جسے کوئی شکست نہ دے سکا

اہلِ دُنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

بانگِ درا

اس سے میں ساری دنیا کو قیدی بنا کر خود
ایسا آزاد ہو جاؤں کہ میری زندگی میں کوئی
دخل انداز نہ ہو سکے۔ چنانچہ رات دن
ان مشغلوں سے بھرپور محویت کے
کے ساتھ، بھٹی کے سامنے ہتھوڑوں کی
بیدردچوٹوں سے ان بیڑیوں کو بنانے
میں مصروف رہا۔ آخر کار جب کام ختم
ہوا اور کڑیاں سخت اور مضبوط ہوگئیں
تب میں نے اپنے آپ کو ہی ان میں
جکڑا ہوا پایا۔

یہ درست ہے کہ انسان خود اپنے عمل ہی سے اپنا مقام تعمیر کرتا ہے اور خود ہی اس عمارت کو جہنم بناتا ہے اور خود ہی جنت، دوزخ کی تپش کی حقیقت یہی ہے کہ انسان کو اس کے اعمالِ بد کے مطابق سزا ملے گی اور اسی نسبت سے آنچ دی جائے گی، تو بقولِ اقبالؒ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ گئی کہ انسان خود ہی قادرِ تقدیر ہے۔ تقدیر پگھلی ہوئی موم ہے کہ کوئی شکل اختیار کرنا اس کی قدرت کے تابع نہیں ہے۔ بلکہ انسان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

۳۱۔ الف: جو دنیا والے میرے دوست ہیں وہ مجھے
قید کرنا چاہتے ہیں لیکن تمہاری محبت برتر
اور انوکھی ہے۔ تم مجھے آزاد ہی رکھتے ہو۔

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی
بانگِ درا

کہیں تو ٹیگور اپنی اس کیفیت کا اعلان کرتا ہے کہ میں تیرے درشنوں کو ترس گیا ہوں اور میں ایسا بدنصیب ہوں کہ تم آتے بھی ہو تو تمہیں دیکھ نہیں پاتا اور کہیں یہ کہہ دیتا ہے کہ دُنیا کی رنگینیاں اگرچہ دعوتِ فریب دیتی ہیں لیکن مجھ پر چونکہ تیرا خاص کرم اور سایہ ہے اسلیئے مَیں اس دامِ فریب سے آزاد ہی رہتا ہوں۔ لیکن اقبال اس دامِ فریب کو ظلمتِ شب سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور انہی ظلمتوں میں انہیں امید کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے۔

ب: وہ مجھے اکیلا کبھی چھوڑتے ہی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں انہیں بھول جاؤں۔ پر تم ہو کہ زمانہ گذر جاتا ہے اور تمہارے درشن نہیں ہوتے۔ اگر دعاؤں میں تمہارا خیال بھی نہ کروں۔ اگر میں تمہیں دل میں بھی نہ بٹھاؤں تب بھی ہمیشہ تمہارا محبوب خیال میری محبت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

شمعِ محفل ہو کے جب تُو سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

یہ محض فریبِ نفس ہے کہ انسان سکونِ دل کی خاطر
انگاروں کو پھولوں میں، پتھر کو موتی میں، ریگستان
کو دریا میں، اور خزاں کو بہار میں تبدیل کر کے
شاعرانہ نگاہ سے دیکھتا رہے۔ ورنہ اگر وہ
صاحبِ نظر ہے تو اس کا ضمیر پکار پکار کر کہہ
دے گا کہ یہ دھوکا ہے۔ صاحبِ قلب و نظر
ایک غلط تصوّر کی بنیاد پہ زندگی کی عمارت تعمیر
نہیں کرتے، وہ اپنے محبوب سے الگ نہیں
رہتے اور وہ سارے حجاب چاک کر کے
حقیقت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ جسے وہ
وصال کہتے ہیں۔

۴۳۔ الف:۔ دن کے وقت وہ میرے گھر آئے اور بولے ہمیں یہاں تھوڑی سی جگہ چاہیئے ہم تمہارے خدا کی عبادت میں مدد دیں گے اور ثمر میں سے صرف اپنا ہی حصہ لیں گے اور تب ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گئے۔

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تُو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تُو
"بانگِ درا"

ہے زمانے کا تقاضا انجمن!
اور بے خلوت نہیں نورِ سخن
"بالِ جبریل"

گویا ٹیگور نے ان لوگوں کو اپنی انجمن میں اجازت دے دی کہ وہ اس کے شریکِ عبادت ہو کر اُس کی معاونت کر سکیں، حالانکہ عبادت میں ایک چیز ہے جس میں کوئی کسی کا معاون نہیں بن سکتا اور اگر معاونت سے عبادت کے فرائض سر انجام دیئے جائیں تو وہ عبادت نہیں ہو گی۔ کیونکہ عبادت کا تعلق براہِ راست دل سے ہوتا ہے اور شوقِ عبادت کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔

ب:۔ لیکن رات کی تاریکی میں وہی لوگ مغرور بن کر طاقت کے ساتھ میرے پوتر مندر میں گھس آئے اور ناپاک تمنا کے ساتھ عبادت گاہ سے چڑھاوا چھین کر لے گئے۔

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تُو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حُور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو!
"بالِ جبریل"

اس بیان سے ثابت ہوا کہ ٹیگور کی آنکھ کو وہ بینائی عطا نہیں فرمائی گئی تھی جس سے صاحبِ نظر دوسروں کے اندرون کا مطالعہ کر لیتے ہیں اور اسکے ساتھ چڑھاوا وغیرہ کی قیود کو وہ لازم قرار دیتا ہے جو کہ ہندو مذہب تک محدود ہے اور اسلام کا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ اور اقبالؒ کے نزدیک تو عابد ہی وہ ہے جو شاہینِ شہِ لولاک ہے، جس کے ماتحت افرشتہ و حُور ہوں

۴۴۔ الف:۔ اے خدا مجھ میں میرا اعتقاد اتنا ہی رہنے دے
کہ جس سے میں تمہیں ہی اپنا سب کچھ کہہ سکوں۔
مجھ میں صرف اتنی ہی خواہش رہنے دو جس
سے میں تمہیں چاروں طرف معلوم کر سکوں اور ہر
شئے میں تمہارا جلوہ دیکھ سکوں اور ہر لمحہ تمہارے
قدموں میں رہ کر تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ میرا
اعتقاد اتنا ہی باقی رہے کہ جس کے سہارے
میں تمہیں نہ چھپا پاؤں۔

ہ دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
"بالِ جبریل"

ٹیگور اللہ سے ایسی التجائیں، ایسا اعتقاد اور ایسی تمنائیں طلب کرتا ہے کہ اس میں ذوقِ دید پیدا ہو یا باقی رہے لیکن وہ اپنے معبودِ محبوب کا پیغام ہی نہیں سمجھتا جس نے اس حقیقت کا اعلان فرما دیا ہے کہ ہم دیکھنے والوں کو ایک الگ بینائی عطا فرمایا کرتے ہیں، بشرطیکہ کوئی اس کا خواہاں ہو۔

ب:۔ میرے بندھن صرف اتنے ہی باقی رہیں کہ
جن سے میں تمہاری ہی خواہشوں سے بندھا
رہوں اور اس زندگی میں تمہارا ہی مقصد
پورا کر پاؤں، تمہاری محبت ہی کا تو یہ بندھن
ہے۔

ہ خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر
"بانگِ درا"

۳۵۔ الف دل میں جہاں خوف نہیں یا دماغ جہاں ترقی کرتا ہے
اور علم جہاں آزاد ہے گھریلو زندگی کے چھوٹے بندھنوں کے
سہارے جہاں دنیا پاش پاش نہیں ہونے پاتی ہے سچائی
کے جھرنے سے جہاں الفاظ نمودار ہوتے ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
بانگ درا

ٹیگور کا مقامِ تجسس نہایت احسن ہے کہ جہاں پہنچ کر دل میں خوف باقی نہیں رہتا لیکن ساتھ ہی وہ اسی مقام کو اس خوبی کا منبع بھی بتاتا ہے جہاں دماغ ترقی پاتا ہے حالانکہ دماغ محض چراغِ منزل ہے خود منزل نہیں ہے البتہ قلب واقفِ منزل ہے اور خود منزل بھی ہے۔ ٹیگور واقعی اپنی اصلیت سے بے خبر ہے ورنہ ان بندھنوں میں مقیّد رہنا پسند نہ کرتا۔

ب۔ دن رات کی مسلسل اور ان تھک محنت جہاں اختتام
تک پہنچتی ہے اور فلاسفی کی مقدس آبشار پرانی روایات کی
خشک زمین پر گمراہ نہیں ہو گئی ہے۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
بالِ جبریل

ٹیگور کا تخیل کتنی بلندی تک کیوں نہ پہنچ جائے وہ پھر بھی عالم رنگ و بو کی حدود سے باہر پرواز نہ کر سکے گا اور یہ حدود صاف ظاہر ہے کہ ایک جہانِ خورد و نوش ہے عالمِ اللہ ھو نہیں ہے۔

ج۔ اور جہاں تیرے کرم سے دماغ اچھے خیالات اور اچھے
اعمالوں کی مہربانی سے پرورش پاتے اور وہیں لے نہ جان
مالک نجات کے اس منور عالم میں میرے وطن کو بیدار کرو۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے
بالِ جبریل

۳۶- الف:- میرے مالک! میری تم سے یہی التجا ہے کہ تم میرے دل کی تمام کمزوریوں کو جڑ سے ہی مٹا دو اور ایسی طاقت بخش دو کہ میری محبت خدمت میں تبدیل ہو جائے۔

الٰہی! عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے!
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے
"بانگِ درا"

ٹیگور خداوندِ بزرگ و برتر سے اُس طاقت کا خواہشمند ہے جو اپنے اثر سے محبت کو خدمت میں تبدیل کر دے اور اقبالؒ اس جنون کا متمنی ہے جو اپنے اثر سے محبت کو دیوانگی میں بدل دے تاکہ وہی دیوانگی اُسے مقامِ قلندری تک پہنچا دے۔

ب:- ایسی طاقت بخش دو جس میں محتاجوں کو نہ بھول سکوں اور مغرور طاقت کی ناانصافی کے آگے سر نہ جھکاؤں۔

میرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب
بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بیتاب
تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں
عکس آباد ہو تیرا میرے آئینے میں
"بانگِ درا"

ج:- ایسی طاقت دو کہ روزمرہ کی زندگی کی کمزوریوں سے بلند تر ہو سکوں۔ یا۔ اے خدا! ایسی طاقت دو کہ جس سے میں اپنی طاقت کو محبت سے تمہاری خواہشوں پر قربان کر سکوں۔

ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوزِ حیات
ہو عیاں جوہرِ اندیشہ میں پھر سوزِ حیات
"بانگِ درا"

یہ تمنا تو صرف ایک مردِ مجاہد ہی کے سینے میں تڑپ کر پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کو خدا کی راہ پر قربان کر دے، اور شہادت کا مقدس رتبہ حاصل کرے۔ لیکن ٹیگور تو اس مقام سے روشناس ہی نہیں ہے وہ تو مسئلہ آواگون کا معتقد ہے اور ہندو دھرم کا پیروکار، پھر وہ ایسی بلند تمنا کا متمنی کیونکر ہو سکتا ہے؛ یہ ایک آدرش ہے جو ہر بنی نوعِ انسان کی آب و گل میں فطری طور پر موجود ہوتی، لیکن نمود اور صرف مردِ مومن ہی کے پیکر سے ہوتی ہے۔

۱- الف ۔ میری طاقت جب نحیف ہو چکی تب میں نے سمجھا کہ میرا سفر ختم ہو گیا ہے اور آگے کا راستہ بھی بند ہو گیا ہے اور زادِ راہ بھی ختم ہو گیا ہے، اور اب کہیں ٹھنڈی چھاؤں میں سہارا لینے کا وقت آ گیا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

"بانگِ درا"

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

"بالِ جبریل"

ٹیگور عمر کے آخری حصے کو دم لینے کا وقت سمجھتا ہے، حالانکہ انسان کسی عمر میں بھی سہارے نہیں ڈھونڈتا، بشرطیکہ اس کی نگاہ اللہ پر ہو، اور اس کی قوتِ عمل شل نہ ہو گئی ہو۔

ب:۔ لیکن میں نے اپنی زندگی میں تمہاری خواہشوں کا انت نہ پایا۔ جب زبان پر پرانی دھن ٹوٹ جاتی ہے، تب نئے نغمے پھوٹ پڑتے ہیں، جہاں پرانے راستے غائب ہو جاتے ہیں وہاں ہی حیرت انگیز آبادیاں تعمیر ہوتی نظر آ جاتی ہیں۔

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سُرمۂ امتیاز دے

"بانگِ درا"

حکیم و عارف و رُومی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عینِ مستوری

"بالِ جبریل"

۴۳۸۔ الف:۔ میں تمہیں چاہتا ہوں، صرف تمہیں ہی۔ میرے دل کو ہمیشہ یہی کہنے دو، اور دوسری تمام آرزوئیں مجھے دن رات پریشان کئے رہتی ہیں جو کہ جھوٹی اور فضول ہیں۔

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تُو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تُو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
"بانگِ درا"

وہ شخص جو صرف اور صرف اپنے محبوب معبود کو ہی چاہتا ہے، اُسے دُنیا کی بے ثبات آرزوئیں پریشان نہیں کر سکتیں، کیونکہ مقامِ عشق پر پہنچ کر عاشقِ صادق دُوسری قسم کی تمناؤں سے مطلق بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ آلائشیں اُس کے گرد و پیش موجود ہیں تو سمجھ لیجئے کہ ابھی وہ منزل ہی میں ہے۔

ب:۔ رات کے اندھیرے میں جس طرح دن کی روشنی غائب رہتی ہے اسی طرح عالمِ مدہوشی میں بھی یہی پکار اُٹھتی ہے "میں تمہیں چاہتا ہوں صرف تمہیں کو (دُنیا کو نہیں)

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب!
کیا لُطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گذاروں
دُنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
"بانگِ درا"

ج:۔ امن شکنی کے بعد جس طرح بھیانک آوازیں پیدا ہو کر خاموش ہو جاتی ہیں اسی طرح میری بغاوت تمہاری محبت پر چوٹ لگا کر یہی پکارتی ہے اور دل یہی بولتا ہے: "میں تمہیں چاہتا ہوں صرف تمہیں کو"

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

۳۹۔ الف: جب میرا دل سخت اور خشک ہو جائے
تب میرے محبوب مالک! مجھ پر کرم
کی بارش کرتے رہنا۔ زندگی میں جب
زیبائش کی رونق تباہ ہو جائے، اُس
وقت اپنے پیارے نغمے چھیڑتے آنا۔

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کب تک؟
بے حجابانہ مِرے دل سے شناسائی کر

بانگِ درا

زندگی کا دوسرا نام خود نمائی اور زیبائش ہے۔ جب یہ جوہر ہی ختم ہو گیا تو زندگی کہاں باقی رہی اور جب کہ خدا سراپا برقِ نور اور نورِ برق ہے تو پھر اُس سے اُس وقت روشنی طلب کیوں کی جائے جب اپنی دُنیا میں بالکل اندھیرا چھا جائے، یہ تمنّا کیوں نہ کی جائے کہ اس کا نور ہمیشہ قائم رہے تاکہ اندھیرے کا وقت ہی نہ آئے۔

ب: دُنیا کے کاروبار کی ہلچل اگر مجھے چاروں
طرف سے گھیر لے، تو اے میرے
خاموش مالک! اپنے امن چین کے
ساتھ میرے نزدیک آنا۔

کِس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قُدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

بانگِ درا

جب انسان کی ہم نفس قدرت ہو تو پھر اسے مزید کیا چاہیئے۔ اے کاش ٹیگور اس حقیقت سے روشناس ہو جاتا۔

ٹ: بھکاری سا میرا دل اگر غریب ہو کر کہیں گوشۂ تنہائی میں شرما کر بیٹھ جائے تو میرے مالک! تم دروازہ توڑ کر میرے لئے سکونِ زندگی لے کر جلوہ افروز ہو جانا۔

ا: اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

بانگِ درا

بیٹھ جانا ہی تو خلافِ ہمّت واستقلالِ انساں ہے، اور اسی شئے کا دوسرا نام اجل ہے، اور اس کے برعکس مسلسل عمل کا نام زندگی ہے جو آدمی کے لئے باعثِ صد فخر و ناز ہے۔

ٹ: جب خواہش میری رُوح کو غبار آلود دامِ دولت سے اندھا کر دے، اُس وقت اے میرے مقدّس مالک! اپنے نورانی قہر و غضب کے ساتھ تشریف لانا، تاکہ میری زندگی منوّر ہو جائے اے خُدا!

ا: زندگی ہو مری پروانے کی صُورت یارب!
علم کی شمع سے ہو مجھکو محبّت یارب

بانگِ درا

۴۔ الف: اے خدا! میرے خشک دل ہیں تمہاری آبحیات کی بارش ہوئے کتنے ہی دن گذر چکے ہیں۔ مطلع بالکل صاف دکھائی دیتا ہے، دھندلے بادل بھی نہیں ہیں اور نہیں سرد جھونکوں کا نام و نشان بھی۔

تنگ بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم نگوں جام و سبو کر لے
"بانگِ درا"

بقولِ ٹیگور، یہ وہ سماں ہے جبکہ قہرِ خدا غضب میں ہو چونکہ ٹیگور اس حقیقت کا خود اقرار کرتا ہے کہ اللہ کا فضل و کرم ہوئے کئی دن گذر گئے ہیں تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برسوں فضلِ الٰہی سے محروم رہ جاتا تھا۔

ب: چلا دو بھیانک آندھی اور طوفان اور لرزا دو سارے عالم کو اور کر دو دنیا کو چکا چوند اپنی بجلی کی چمک سے۔

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے
"بانگِ درا"

ٹیگور دنیا کے لئے قیامت چاہتا ہے لیکن اقبال ایسی روشنی کا طالب ہے جس سے خود افروزی کا سراغ مل جائے اور ایسی بجلی جس سے جگر سوزی کی تپش حاصل ہو۔

ج: کم از کم اے خدا! اس خاموش، منجمد اور خشک، چلچلاتی دھوپ کا تو خاتمہ کر دو، جو میرے دل کو نا امیدی کی آگ میں جلا کر فنا کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
"بانگِ درا"

د: جس طرح باپ کا غضب دیکھ کر بچے کی ماں کی آنکھوں میں ممتا کے آنسو بھر آتے ہیں اسی طرح مجھ پر محبت، شفقت اور مہربانی کے بادل برسا دو

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے
"بانگِ درا"

۴۵۔ (الف): میرے پیارے تم اُن سب کے پیچھے سائے میں کہاں چھپے کھڑے ہو؟ تمہیں ٹھکرا کر تمہیں دھول میں دھکیل دے کر وہ چلے جاتے ہیں۔ اور میں کتنی دیر سے پوجا کا سامان دھرے تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ آنے جانے والے آتے ہیں، اور ایک ایک کر کے پھول لے جاتے ہیں۔ ٹوکری بھی قریب قریب اب خالی ہو چکی ہے۔

آ میں تجھے دکھا دوں رخسارِ روشن اُس کا
نہروں کے آئینہ میں، شبنم کی آرسی میں

بانگِ درا

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گُل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بُود

بانگِ درا

ٹیگور ٹوکری میں پھول بھر کر مالن کے رُوپ میں اپنے معبود کے درشنوں اور پوجا کی خاطر راہ میں بیٹھا ہوا ہے اسکے نزدیک یہی مقامِ نیاز ہے اور یہی طریق وسیلۂ وصل ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ دیکھنے والے تو اسے ایک معمولی ذرّے میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ عقل اور علم کی روشنی میں اس کا سراغ نہیں ملتا بلکہ دل کی تڑپ اور تجسّس ہی اسے پا سکتی ہے۔

ج: صبح گذر گئی اور دوپہر بھی۔ شام کے اندھیرے
میں آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جارہی
ہیں۔ گھر لوٹتے ہوئے لوگ مجھے دیکھتے
ہیں اور مسکراتے ہیں۔ میں شرم سے لجا
جاتی ہوں۔ بھکارن سا گھونگھٹ نکال
کر میں بیٹھ جاتی ہوں، اور جب وہ مجھ
سے پوچھتے ہیں کہ مجھے کیا چاہیئے؟ تب
میں نیچی نگاہ کر کے لاجواب ہو جاتی ہوں۔

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں!
آہ وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

تو جس کو ڈھونڈتا ہے تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں

بانگِ درا

ٹیگور کو احساسِ ناکامئ نیاز سے ندامت ہے (صبح سے شام تک) گویا وہ تمام عمر ناکام ہی رہا اور آخر وقت میں اسی بارِ ندامت سے اسکی آنکھیں نہیں اٹھتیں اور وہ دنیا کے سامنے لاجواب ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ جسے وہ عمر بھر تلاش کرتا رہا وہ اسکی اپنی آب و گل میں جلوہ گر ہے، اسی پیکرِ خاکی میں نہاں بھی ہے اور عیاں بھی۔

ج: لیکن میرے پیارے میں انہیں کہہ بھی کیسے
سکتی ہوں کہ تمہارے آنے کے وعدہ پر تمہاری
راہ دیکھ رہی ہوں، شرم کی وجہ سے میں کیسے
کہہ سکتی ہوں کہ غریبی ہی تمہاری نذر کرنے کے
لیے رکھی ہوئی ہے۔ آہ اسی راز کو میں اپنے
سینے کے اندر چھپائے رکھتی ہوں۔

نہ طبیعت ہی جنکی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں۔
خوشی روتی ہے جسکو میں وہ محرومِ مسرت ہوں۔

علامہ اقبالؒ نے نامرادی کی جو مثال پیش فرمائی ہے، اس سے زیادہ اس مقام کیلئے زیادہ مناسب استعارہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ٹیگور کی بھی اسی عکس کی سی کیفیت ہے۔

ح : گھاس پر بیٹھی بیٹھی آسمان کی جانب تکتی رہتی ہوں۔ ے

اور تمہارے اچانک آنے کا سہانا خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ آہا سب کے سب دیپ جل رہے ہیں اور رتھ پر سنہری جھنڈے لہرا رہے ہیں، اور آنے جانے والے حیرت سے کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور جبکہ تم اپنی رتھ سے اُتر کر بادِ نسیم میں جھومتی ہوئی شاخِ نازک کی طرح بصد انداز مجھ ناز و حیا میں لپٹی ہوئی کو خاک و خاشاک سے اُٹھا کر اپنی آغوشِ رحمت میں بٹھا لیتے ہو، مگر وقت گذرتا جا رہا ہے۔ لیکن تمہارے رتھ کے پہیوں کی آواز نا حال سنائی دے رہی ہے۔

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھکو
سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر

بالِ جبریل

ے پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

بالِ جبریل

ے گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے ہُو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

بالِ جبریل

ٹیگور کو معراجِ انسانیت حاصل نہ ہو سکا، اور وہ مقامِ بشریت پر بھی نہ پہنچ سکا۔ البتہ اُسنے ناز و نیاز کی آرزو ضرور پیدا کر لی تھی، لیکن صراطِ مستقیم سے ناواقف رہ جانے کی وجہ سے کسی صحیح راستے پر چل کر کسی صحیح مقام پر نہ پہنچ سکا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ وہ منزلتِ فراق بھی نہ سمجھ سکا حالانکہ یہ بھی ایک مقدس مقامِ عشق ہے۔

ل کتنے ہی لوگوں کا ہجوم اپنے عیش و عشرت میں مست ہو
کر میرے قریب سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ کیا صرف ایک
تمہیں اُن سب کے سائے میں چپ چاپ کھڑے رہو گے
اور کیا میں ہی دل ہار کر تمہاری انتظار میں اشکبار رہونگی؟

گو بڑی لذّت تیری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیّت سی مگر تیری شناسائی میں ہے
اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں نہیں
نگاہ کو نظارے کی تمنّا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا
(بانگِ درا)

مانا کہ خدا پیکرِ خاکی میں موجود ہے تسلیم کیا کہ اُس کا ظہور ہر نظارہ فطرت میں ہے لیکن پھر بھی ایک ہستی لاشریک ایسی ہے جو ان سب جلووں سے الگ وجود رکھتی ہے جسے نورِ یکتا کے نام سے پکارا جاتا ہے اس لئے جب تک اُس جلوہ حقیقی کا نیاز نہ ہو جائے پیاسی آنکھوں کو تسکین نہیں ہو سکتی اس مقام پر آکر ٹیگور کی تلاشِ مسلسل اور جستجوئے پیہم قابلِ عزت ہے بشرطیکہ وُہ مادہ پرستی سے الگ اور او نچا رہ کر اپنے معبود کو پکارے۔

---

۲۴ الف۔ آج صبح ہی تو تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اور میں، صرف تم اور میں ایک ہی ناؤ میں بیٹھ کر چلیں گے۔ سفر ہمارا لامتناہی ہوگا اور اُن نامعلوم سمتوں کی جانب۔ اور کوئی بھی کبھی بھی جان نہ پائے گا۔ ہمارے اس سفر کو اُس بحرِ بیکراں میں جب تم چپ چاپ مسکراؤ گے تو میرے نغمے قیودِ الفاظ کی حدود و گذر آزاد امواج کی مانند سُریلی لے میں امنڈ آئیں گے۔

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

بالِ جبریل

ب۔ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے اے میرے مالک! کچھ کام کرنا ابھی بھی باقی ہے کیا؟ دیکھو تو ساحل پر شام چھائی ہے اور شفق کی دھیمی روشنی میں سمندری پرندے اپنے آشیانوں کی جانب اُڑے چلے آ رہے ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

بالِ جبریل

ٹیگور منظرِ شام سے متاثر ہو کر سمجھتا ہے کہ یہ غالباً سکوت کا لمحہ ہے لیکن اقبال اس جد و جہد کی تعلیم دیتا ہے جس میں کسی لمحہ کو سکوت تصور ہی نہیں کیا جاتا۔

ج۔ نہ جانے کب زنجیریں کھل جائیں اور ہماری یہ ناؤ غروبِ آفتاب کی آخری دھندلی کرن کی طرح اندھیرے میں غائب ہو جائے۔

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

بالِ جبریل

ٹیگور کو شام کے دھندلکے خائف کر رہے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتا کہ یہ تاریکیاں مردِ مومن کو متاثر نہیں کر سکتیں اور نہ ہی کسی صاحبِ نظر کے تصورات پہ غالب آسکتی ہیں اور پھر اُس شخص پر جو اپنے نور سے تاریکیِ شب کو منور بنا دے۔ چونکہ ٹیگور کا اندرون اُس شمعِ نور سے محروم ہے اس لئے وہ ان اندھیروں سے مغلوب نظر آتا ہے۔

۲۴۔ الف۔ تمہارے استقبال کے لئے میں اُس دن تیار نہیں تھا۔
لیکن اے مالک تو میرے دل میں معمولی روپ میں ہی بغیر بلائے
جلانے ہی چلے آئے۔ تبھی تم نے میری زندگی کے بے شمار
لمحوں پر روزمرّہ روشنی کی مُہر ثبت کر دی۔

ب۔ اور آج جب یکایک اُن لمحوں پر پھر دیکھ پاتا ہوں کہ وہ
میری زندگی کو بیکار دنوں کی دکھ اور سکھ کی دیرینہ یادگار کے
ساتھ دھول میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔

ج۔ گرد اور مٹی کے طفلانہ کھیل سے تمہیں کبھی نفرت نہیں ہوتی
اے خدا! وہ وہی تمہاری جو میں نے اپنے کھیل کے صحن میں
سن پائی تھی اب میں اُسے تاروں بھرے آسمان میں
سن پاتا ہوں۔

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بیتاب تخیّل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں — بانگِ درا

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے — بانگِ درا

انساں ہے شمع جس کی محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں منزل وہی ہے تیری
بانگِ درا

۴۴ الف۔ جہاں سایہ روشنی کا پیچھا کرتا ہے اور جہاں بھیانک گرمی کے بعد بارش آتی ہے وہاں سڑک کے کنارے تمہارا انتظار کرنے اور راستہ دیکھنے میں ہی مجھے خوشی ملتی ہے۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا بانگِ درا

ب۔ پوشیدہ دنیا سے پیغام بر پیغام لاتے ہیں اور میرا استقبال کر کے جلدی سے اپنا راستہ پکڑتے ہیں۔ اندر ہی اندر میرا دل پھولا نہیں سماتا اور بہتی ہوئی خوشبو دار ہوا کا مزہ لیتا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر بالِ جبریل

اگر ہم ٹیگور کے اس بیان کو تسلیم کر لیں تو لامحالہ ماننا پڑ گیا کہ ٹیگور پر وحی نازل ہوتی تھی اور فرشتے اُسے ہر نیک و بد سے آگاہ کرتے رہتے تھے لیکن یہ محض شاعری ہے حقیقت کو اس میں دخل نہیں ہے کیونکہ ٹیگور ہر مقام پر اس شے کا اقرار کر رہا ہے کہ اُسے اپنے معبود کی کہیں سے خبر نہیں ملی۔

ج۔ طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک میں اپنے دروازے پر بیٹھا رہتا ہوں میں جانتا ہوں کہ اچھی ساعت میں میں تمہارے دیدار کر سکوں گا۔

نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو بانگِ درا

د۔ اتنے میں اکیلا ہی مسکراتا اور گاتا رہوں گا اور ہوا تمہارے آنے کے وعدے کی خوشبو سے معطر ہوتی رہے گی۔

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ بانگِ درا

اقبال کہتا ہے کہ اس ہوا کے بھی نشانِ پا دیکھ شاید یہی تیری جستجو کے نشان ہوں کیونکہ کوئی مشاہدہ بے نور نہیں ہوتا۔

۴۵ الف ۔ اُن کے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹ تم نے نہیں سُنی کیا؟ وُہ آتے ہیں آتے ہیں ہمیشہ ہی آتے ہیں۔ ہر ایک لمحہ اور زمانہ پر ہر ایک دن ہر ایک رات آتے ہیں اور ہمیشہ ہی آتے رہے ہیں۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں! بانگِ درا

ب۔ دل کی کئی حالتوں میں میں نے بے شمار گیت گائے ہیں لیکن تمام سروں میں یہی شئے نغمہ الاپتی رہی ہے کہ وُہ آتے ہیں آتے ہیں اور ہمیشہ ہی آتے رہے ہیں۔ کھلے ہوئے شگفتہ بسنت کے شہد آلود دنوں میں سہانے جنگلوں کی پگڈنڈیوں سے وُہ آتے ہیں آتے ہیں ہمیشہ ہی آتے ہیں۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
جس کی چمک ہے پیدا جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
استادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے
بلبل میں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں بانگِ درا

ج۔ ساون کی تاریک برستی ہوئی راتوں میں بادلوں کی گرجتی ہوئی رتھ میں سوار ہو کر وُہ آتے ہیں آتے ہیں ہمیشہ ہی آتے ہیں۔ سینکڑوں مصیبتوں سے مصیبت زدہ روح کو وُہ آ کر امن اور سلامتی بخشتے ہیں اور اُن کے ہی قدموں کا سنہری چھونا میری خوشی کو تازگی بخشتا ہے

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی بانگِ درا

اس عمر میں پہنچ کر ٹیگور نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ معبودِ عالم کا وجود مٹی کی مورتیوں میں نہیں بلکہ ہر ذرّہ کائنات میں جلوہ گر ہے چنانچہ فطرت کی تمام رنگینیوں میں اُسے اس کا ظہور نظر آنے لگا لیکن جہاں تک ہم نے تحقیق کیا ہے اور ٹیگور کا مطالعہ کیا ہے اُس سے یہی سراغ ملتا ہے کہ ٹیگور نے یہ مقامِ نظر بھی خرد کی پختہ کاری سے حاصل کیا تھا دل کے گوشوں کو اس کے اس ادراکی علم سے کوئی تعلق نہ تھا اور دل کا بے تعلق رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وُہ نیازِ معبود سے محروم ہی رہا۔

۴۶ الف۔ مجھے معلوم نہیں کتنے وقت سے تم مجھ سے ملنے کے لئے میرے قریب چلے آ رہے ہو۔ ہمیشہ کے لئے تم مجھ سے شمس و قمر چھپا کر نہیں رکھ سکتے۔

ب۔ کئی بار صبح و شام تمہارے قدموں کی آہٹ سنائی دی ہے اور تمہارے قاصد نے کئی بار میرے دل میں گھس کر پوشیدہ پیغام پہنچائے ہیں۔

ج۔ نہ جانے آج میں اتنا کیوں پریشان سا ہو رہا ہوں اور خوشی سے پاگل میرے دل میں سرسراہٹ ہو رہی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کام بند کرنے کا وقت آ گیا ہو۔ ہوائیں تمہاری میٹھی آمد کی بھینی بھینی سی خوشبو پھیل رہی ہے۔

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں
بانگ درا

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بیقرار ہے جلوۂ عام کے لئے
بانگ درا

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں!
بانگ درا

خوشی میں پریشانی اور پریشانی میں خوشی یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں اور کبھی بیک وقت دونوں کا یکجا ظہور ہونا خلافِ آئینِ فطرت ہے لیکن ٹیگور کا شاعرانہ تخیّل اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے۔

۴۷ الف اُن کا بیکار انتظار کرتے کرتے قریب ساری رات بیت چلی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں صبح کے وقت میں تھک کر سو جاؤں تب وہ اچانک میرے دروازے پر آجائیں۔ پیارے دوستو اُن کے لئے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دینا اُنہیں روکنا مت۔

ہائے غفلت کہ تیری آنکھ ہے پابندِ مجاز
نازِ زیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرمِ نیاز — بانگِ درا
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وُہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں — بانگِ درا

جو معبود یا محبوب دل کے گوشوں میں عریاں و پنہاں ہے پھر اس کا انتظار کیا معنی؟ کسی جگہ تو ٹیگور اس شے کا اعتراف کرتا ہے کہ وُہ اپنے معبود کے انتہائی قریب ہے اور معبود اُس کے جوار میں ہے۔ اور کسی مقام پر صاف طور پر اپنی اور اپنے معبود کی بے اعتنائی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جو طالبِ دیدار کے لئے نازیبا ہے۔ ٹیگور سر گرمِ جستجوئے جلوہ ہے لیکن اقبال اس کے برعکس آدمی کو سراپا ناز بن جانے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ خود خدا کو اپنے بندے کے نیاز کی طلب پیدا ہو۔

ب اُن کے قدموں کی آہٹ سے اگر میری نیند نہ کھلے تو میری خاطر از راہِ کرم مجھے جگانا مت میں نہیں چاہتا کہ صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کی تقریب میں پرندوں کے آزاد راگ یا ہوا کا شور و غل مجھے نیند سے اٹھا دے اگر میرے مالک یکایک ہی میرے دوار پر ہی آ جائیں تب بھی میری نیند میں خلل نہ ڈالنا۔

آہ اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں اُلجھنے والے
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیاہ روز رہے پھر نہ سیاہ کار رہے — بانگِ درا

حیف ہے وُہ عاشق کہ جو شبِ وعدہ سو جائے اور خدامِ ادب کو بھی تاکید کر دے کہ محبوب کے آنے پر جگایا نہ جائے۔ یہ ہے وُہ جذبِ دُروں جس کی حقیقت بے نقاب ہوئی جا رہی ہے۔

ج۔ قیمتی خواب یا تو اُن کے چھونے پر ہی پیدا ہوگی لیکن میری خواب آلودہ آنکھیں تو اُن کے نورِ تبسم سے ہی وا ہوں گی جب وُہ

نیند کی تاریکی میں خواب کی طرح میرے سامنے جلوہ گر ہو نگے اُن کا ہی حسن اور نور اور جلوہ سب سے پہلے مجھے دکھائی دے۔ میری بیدار رُوح میں سب سے پہلے اُن کے ہی انداز کی لہر لہرا جائے اور وصالِ رُوح ہوتے ہی میں اُن میں سما جاؤں۔

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اَور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

بانگِ درا

۴۸ الف۔ صبح کے بحرِ خاموش میں پرندوں کی میٹھی ہل چل سے موجیں اٹھ رہی تھیں۔ راستے کی کیاریاں کھل رہی تھیں۔ بادلوں کے جھنڈ میں سے سنہری کرنیں پھیل رہی تھیں لیکن اپنے کام میں ہی ہمہ تن مصروف ہم بغیر ان پہ توجہ دیئے قدم بڑھاتے چلے گئے۔

ب۔ میں نے نہ گیت گائے نہ بنسی ہی بجائی نہ خرید و فروخت کے لئے ہم گاؤں میں گئے نہ کہیں بولے نہ مسکرائے اور نہ راہ میں کہیں ٹھہرے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہم اور بھی تیز رفتار سے قدم بڑھاتے چلے گئے۔ مقدس آفتاب مرکزِ فلک پر جلوہ گر ہوا اور پرندے سائے میں جمع ہو گئے۔ مرجھائی ہوئی سوکھی ہوئی پتیاں دوپہر کی گرم ہواؤں میں ناچنے لگیں۔ چرواہا کمسن بڑ کے سائے کے نیچے خواب لینے لگا۔ اور میں نے بھی تالاب کے کنارے لیٹ لگائی۔

ج۔ میرے ساتھی مجھے نفرت سے دیکھ کر ہنسے اور غرور سے سربلند ہو کر چل دیئے اور نہ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور نہ ہی کہیں انہوں نے دم لیا۔ اور دور آسمان کے نیچے دھندلے دیش میں غائب ہو گئے۔ بے شمار جنگلوں اور پہاڑیوں کو پار کر کے نہ معلوم دور ملکوں کو چلے گئے۔ اے منزلِ بیکراں کے

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

بانگِ درا

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

بانگِ درا

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

بانگِ درا

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اُن تھک مسافر د تم پر آفرین ہو غیبت اور ٹھٹے کی تکلیفوں نے مجھے اٹھانے کی بے انتہا کوشش کی لیکن میں اٹھا ہی نہیں۔

د۔ خوشی میں ڈوبی ہوئی عاجزی میں میں نے اپنے آپ کو کھو دیا سُورج کی کرنوں سے چھاؤں کے نقش و نگار میرے دل کو آرام کے لئے مجبور کرنے لگے اور اپنے سفر کے مقصد کو میں بھول گیا۔ اور اپنے آپ کو آسانی سے میں نے گیت اور چھاؤں کے دامِ فریب میں اسیر کر دیا۔

ل۔ آخیر میں جب میری نیند کھلی تو تم کو اپنے نزدیک ہی کھڑے پایا۔ تمہاری مسکراہٹ میری نیند میں جذب ہو رہی ہے فضول ہی تو میں ان لمبے دقیق راستوں سے ڈر رہا تھا۔

انجام ہے اِس خرام کا حسُن
آغاز ہے عشق انتہا حسُن

بانگِ درا

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے

بالِ جبریل

ضو سے اس خورشید کی اختر میرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

بانگِ درا

۴۹ - الف - اپنے آستانے سے اتر تم میری جھونپڑی کے دروازے پر آکھڑے ہوئے ہو - اکیلا ایک گوشے میں بیٹھا میں گا رہا تھا کہ گانے کی دھن تمہارے کان میں پڑی تم آئے اور میری جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے -

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میر صاحب

کہیں تو ٹیگور اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ میں اُسے چاروں طرف پکارتا ہوں - لیکن وہ نظر نہیں آتے اور کہیں اس کی شاعری سے یہ ثابت ہوتا ہے - کہ اس کی آواز میں یہ تاثیر تھی کہ جونہی اس کی پکار کی آواز عرش پر پہنچی قدرت سمٹ کر اُس کے دروازے پر آگئی - لیکن یہ محض شاعری ہے حقیقت کو اس میں دخل نہیں ہے

(ب) بے شمار ہوشیار مغنی تمہاری حرم سرائے میں ہمیشہ ہی راگ الاپتے ہیں لیکن نو آموز معمولی تان نے تمہارے پریم کو بیدار کر دیا اور میرا معمولی سا چھوٹا راگ اس دنیا کے بلند نغمے میں سما گیا -

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیوں کر ہوا!

بانگِ درا

ج - پھول کا تحفہ لے تم نیچے اترے اور میری جھونپڑی کے دروازے پر آکر کھڑے ہوئے -

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات

بانگِ درا

یہ وہ مقام ہے جہاں ہندو دھرم کے عقیدہ کے مطابق پھولوں کی بھینٹ لینے کے بعد ایک خاص لطف و کرم کے ماتحت دیوتا پتھر کی مورتیوں میں جلوہ گر ہوتا ہے - اور صاحبِ نصیب لوگوں کو درشن ہو جاتے ہیں - لیکن یہ ڈھونگ اسلام کے نزدیک مضحکہ خیز امر ہے جس کا تعلق مادیات تک محدود ہے -

۵۰ - الف - گاؤں کے راستے میں ہر دروازے پر میں -
بھیک مانگتا پھر رہا تھا کہ سنہری خواب کی مانند بہت
دُور تمہارا سنہری رتھ رونما ہوا میں تعجب میں پڑ
گیا کہ راجاؤں کا راجہ کون ہے ؟

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
غالب

صحرا و دشت و دریا میں کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے
بانگِ درا

ایک لمحے میں تو ٹیگور اپنے تئیں خدا کا ہمراز و ہم نشیں ظاہر کرتا ہے - اور دوسرے ہی
لمحہ میں اسے پہچان بھی نہیں سکتا اور بقولِ غالب اس کی اندرونی کیفیت عجیب او گو مگو کی
سی رہتی ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ بقولِ اقبالؒ اس کا جلوہ انسان کے سینے میں
درخشاں و تاباں ہے -

ب - میری اُمیدیں بڑھنے لگیں میں نے سوچا کہ میرے
بُرے دن ختم ہو گئے رتھ کی وصول میں بکھرے پڑے
لطیف اور عیش و آرام کی بھیک ملنے کی اُمید میں
میں وہیں کھڑا رہ گیا -

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے لُٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
بانگِ درا

عاشق اگر صحیح معنوں میں محبوب کی الفت میں مقید ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو تمام
بندشوں سے آزاد و بے نیاز سمجھتا ہے -

ج - رتھ وہیں آ کر ٹھہرا جہاں میں کھڑا تھا میری طرف
تم دیکھ کر مسکرا کر نیچے اُتر آئے مجھے اپنی زندگی کی
قسمت کا ستارا درخشاں نظر آیا - تبھی یکا یک تم نے
اپنا دایاں ہاتھ پھیلا کر پوچھا - "مجھے دینے کے لئے

پرستشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی میری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیوں کر ہوا
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
بانگِ درا

تمہارے پاس کیا ہے"؟

ہ - آہ ایک بھکاری سے بھیک مانگنا کتنا خوبصورت مذاق ہے یہ - میں گم صُم ہو پریشانی میں پڑ گیا - پھر اپنی جھولی میں سے اناج کا ایک چھوٹا سا دانہ تمہاری خدمت میں پیش کر دیا۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

بانگِ درا

جو شخص اپنے تئیں ایک بھکاری کہے پھر اُس کے متعلق تو خودی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - افسوس کہ ٹیگور نے مقام خودی کو نہ پہچانا اور بغیر کسی مقصدِ خاص اور نصب العین قائم کیئے ایک عالمِ تصورات میں بھٹکتا رہا۔

ل - لیکن دن چھپنے پر میں نے اپنی جھولی زمین پر اُلٹ دی - تو اس چھوٹے سے ڈھیر میں ایک سونے کا دانہ پا کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی - پھوٹ پھوٹ کر نہیں رویا اور پچھتایا کہ ہائے میں نے اپنا سب کچھ ہی تمہیں کیوں نہ دے دیا۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

بانگِ درا

کس قدر بخیلی ہے کہ محبوب آئے اور کچھ طلب کرے - لیکن عاشق ان کی نگاہوں سے سب کچھ چھپا لے اور ڈھیر میں سے ایک دانہ اس کے دامن سوال میں ڈال دے اور کس قدر یہ کم نگاہی ہے کہ انسان یہ بھی نہ جان سکے کہ اللہ اپنا قرضہ بہترین معاوضے میں اُتارتا ہے - یہاں کہنا پڑتا ہے کہ

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

الف: رات چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اور دن بھر کا تمام کام ختم ہو گیا تھا۔ گاؤں کے سب دروازے بند ہو گئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ آنے والے سبھی آ چکے ہیں، صرف کسی کسی نے کہا کہ مالک نے ابھی اور آنا ہے۔ ہم ہنس پڑے، بولے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا!

؎ خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

ارمغانِ حجاز

ب: دروازے پر کھٹکھٹاہٹ سنائی دی، ہم نے کہا کچھ نہیں یہ ہوا کی آواز ہے، دیا بجھا کر ہم لیٹ گئے۔ صرف کسی نے کہا، نہیں یہ قاصد آیا ہے۔ ہم ہنس پڑے، بولے نہیں یہ ہوا ہی ہے

؎ اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

بالِ جبریل

ٹیگور بھی ایک بحرِ تلاش میں ہلکی سی موجِ مضطر کی طرح اٹھا لیکن انتہائے بحر یعنی کنارے سے ہم آغوش نہ ہو سکا۔

ج: نیم شب کو پھر ایک آواز آئی، سوتے ہی سوتے ہم نے سوچا کہیں دور بادل گرج رہے ہیں۔ زمین کانپی، دیواریں ہلیں جس کی وجہ سے نیند میں خلل پڑا تھا صرف کسی نے کہا یہ تو رتھ کے پہیوں کی آواز ہے۔ لیکن ہم نے اونگھتے ہوئے کہا کہ نہیں یہ بادلوں ہی کی گرج ہے۔

؎ پنہاں تہِ نقاب تیری جلوہ گاہ ہے
ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے

ٹیگور کا ضمیر اگرچہ ہر آواز پر اُسے آمدِ محبوب سے آگاہ کرتا رہا، لیکن ٹیگور کی عقلِ ناپختہ اور نگاہِ سطح بین اس اشارہ سے متاثر نہ ہو سکی اور وہ سطحی چیزوں کے مطالعہ تک محدود رہا۔ وہ مادی دنیا سے ٹکراتا رہا یا کبھی عالمِ رنگ و بو میں سرگرداں رہا، لیکن اسکی نگاہ پتھر کے سینے کو نہ چیر سکی

ح۔ رات ابھی اندھیری ہی تھی جب نقارے بجنے لگے، جاگو دیر نہ کرو کی آواز سنائی دی، دل کو دونوں ہاتھوں سے تھام ہم ڈر کر کانپ اٹھے، کسی نے کہا لو یہ خدا کا پرچم ہے۔ فوراً ہی کھڑے ہو کر ہم چلّانے لگے "اب دیر کرنے کا وقت نہیں ہے"

ح ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

بالِ جبریل

ح وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا!

ضربِ کلیم

یہ الفاظ محض ایک غیر محرمِ بانگِ اذاں اور ناآشنائے پیامِ فطرت ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں کہ اذانِ صبح یا نقارۂ صبح کی آواز سُنکر کانپ اُٹھے، اور ڈر گئے" اس بلاوے پر تو بندۂ مومن کی خوشیوں کی انتہا نہیں رہتی کہ وہ صبح کے لمحاتِ اولیں میں سب سے پہلی ملاقات کا شرف اپنے ربّ قدوس کے نیازِ پاک سے حاصل کرتا ہے، لیکن ایک غیر مسلم جو ان لذتوں سے محروم ہے، اس لطف کو کیا سمجھے۔

۱: خدا آپہنچا، لیکن چراغ کہاں ہیں؟ پھولوں کی مالا کہاں ہے؟ تخت کہاں ہے؟ ہائے کیسی شرم کی بات ہے کہ نہ تو محل ہے، نہ ساز و سامان۔ ایک نے کہا ابھی یہ رونا دھونا سب فضول ہے، خالی ہاتھوں ہی انہیں سلام کرو، اور اپنے سنسان محل ہی میں ان کا استقبال کرو۔

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

ضرب کلیم

۲: دروازہ کھول دو، سنکھ بجنے دو، رات کی گہری تاریکی میں، سنسان اور تاریک محل میں خدا، میرے مالک تشریف لائے ہیں۔ آسمان پہ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی کی چمک، اندھیرے کو ڈرا رہی ہے ٹوٹا پھوٹا فرش ہی لے آؤ، اور یہاں صحن میں بچھا دو۔ ڈراؤنی رات میں ہوک کے ساتھ ہی ہمارے مالک کی تشریف آوری ہوتی ہے۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آگئی میسر مری شوخیٔ نظارا

ضرب کلیم

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

بالِ جبریل

الف: میں نے سوچا کہ تمہارے گلے کی مالا تم سے
مانگ لوں، لیکن اتنی جرأت نہ کر سکا۔ آخر
تمہارے چلے جانے کے بعد تمہارے
بچھونے پر کچھ پھول پتے مل جائیں گے
اس امید پر صبح کا انتظار کرتا رہا، لیکن صبح
بھکاری کی طرح ڈھونڈنے پر صرف ایک
دو ہی منتشر پتیاں حاصل کر سکا۔

شیریں کے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا!

بانگِ درا

یہ سب مادیات سے متعلق ہے، جو ہندو دھرم والے مندروں میں جا کر خود تراشیدہ دیوتاؤں سے فریب نفس کے ماتحت ہمکلام ہوتے ہیں ورنہ اس سے زیادہ ٹیگور کی نگاہ میں بلندی نظر نہیں آتی۔

ب: ہائے کیا ملا مجھے، تمہاری محبت کی یہ کیسی
نشانی؟ یہ نہ پھول ہے، نہ کوئی خوشبو ہے
لیکن یہ سنکھڑی شعلہ نور، بھیانک گرج
جیسی تلوار ہے، نسیم صبح کھڑکی سے آ کر تمہارے
بچھونے پر چھا جاتی ہے، پرندے چہچہاتے
ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اے بھولے مسافر! تم
نے کیا پایا ہے؟ نہیں یہ پھول تو نہیں ہے
نہ ہی خوشبو ہے اور نہ خوشبودار پانی۔ یہ تو
تیری بھیانک تلوار ہے۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

بانگِ درا

ٹیگور طلوعِ صبح کے ساتھ کفِ افسوس ملتا ہے کہ شب عبادت کے بعد جو اسے صلہ ملا ہے، وہ دنیا کی نگاہ میں کچھ قیمت نہیں رکھتا، لیکن اقبالؒ کے نزدیک عبادت میں صلہ کی تمنا ہی تنگ نظری کی دلیل ہے، جو ایک عابدِ صادق کی شان کے خلاف ہے، چہ جائیکہ وہ خود اس کا گلہ کرتا پھرے۔

ٹیگور: تعجب سے سوچا کرتا ہوں کہ تمہارا یہ کیسا تحفہ ہے کہاں چھپاؤں میں اسے؟ اسے زیب تن کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، کیونکہ میں کمزور ہوں، دل سے لپٹانے پر بھی تکلیف پہنچتی ہے، لیکن پھر بھی اس کسک کے بوجھ کو تمہاری خاطر میں دل میں جگہ دوں گا۔

اقبالؒ:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

ارمغانِ حجاز

ٹیگور اپنے محبوب سے طعنہ زن ہے کہ اسکی یاد میں چونکہ خلش ہے اس لیئے وہ اس تکلیف دہ شے کو اپنے قریب نہیں لا سکتا۔ اور اگر وہ لائے تو یہ محبوب پر ایک احسانِ عظیم ہو گا، حالانکہ اسے یہ خبر نہیں کہ محبوب کی یاد کو اسکی ذاتی خلش ہی قائم رکھتی ہے۔ ورنہ بقولِ غالبؔ وہ لطف ہی حاصل نہیں ہو سکتا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ہ: آج سے میرے لئے دنیا میں کوئی درد باقی نہ رہے گا۔ میری تمام کشمکشوں کے تم ہی فاتح بن گئے۔ تم موت کو میرا ساتھی بنا کر چھوڑ گئے ہو، اسے میں تاجِ حیات بنا کر رکھوں گا، میرے تمام بندھنوں کو کاٹنے کے لئے تمہاری تلوار میرے پاس ہے ہی، پھر دنیا میں مجھے کوئی بھی ڈر کیسا؟

ہ

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریب تمام
ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

ارمغانِ حجاز

ل آج سے میں اپنی تمام جھوٹی زیبائشوں کو ترک کرتا ہوں۔ اے میرے دل کے مالک اب ایک گوشے میں بیٹھ کر زیادہ رونے کی۔ انتظار کرنے کی یا کسی حجاب کی ضرورت نہ رہیگی مجھے، تم نے اپنی تلوار سجاوٹ کے لئے ہی تو عطا فرمائی ہے۔ اب میں گڑیوں جیسی زیبائش نہ کروں گا۔

ہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم

۵۱۔ الف: ٹیگور کیلئے موتی اور جواہرات سے جڑا ہوا تاروں جیسا کنگن بیحد خوبصورت ہے لیکن تمہاری بجلی سی تڑپتی اور حجاب کے پردوں جیسی شفق کی سرخی سے سجی ہوئی تلوار بہت بھلی لگتی ہے۔

گردشِ مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
"ارمغانِ حجاز"

ٹیگور کا دل بھری رات سے متاثر ہے لیکن اقبال کی تو تعلیم ہی اور ہے وہ ہدایت کرتا ہے کہ دل کو مشاہدات کے جھمیلوں سے بچانا چاہیئے، بلکہ مشاہدات منتظرِ اشارہ رہیں اور دلِ انسان کے زیرِ فرمان رہیں۔

ب: یہ کس میں وقتِ نزع جیسی اذیت پائی جاتی ہے اور بوقتِ الم آخر کی کشمکش کو ایک ہی پلیٹ میں جلا کر فنا کرنے والی منور روشنی ہے۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے
"ضربِ کلیم"

لفظ فنا ٹیگور کے نزدیک ابدی فنا ہے اور یہ سطحی نگاہوں کے تراشیدہ معنی ہیں حالانکہ انسان فنا نہیں ہوتا، بلکہ اپنا مقام بدلتا ہے اُس کا جسم جو عناصر کی ترتیب کا ممنون ہے منتشر ہو کر ختم ہو جاتا ہے، لیکن اُس کی رُوح فنا نہیں ہو سکتی۔

ج۔ تاروں جیسا جواہرات سے جڑا ہوا کنگن بیحد خوبصورت ہے لیکن اے جبار و قہار! تیری یہ تلوار بڑی ہی خوبصورتی سے بنائی گئی ہے اسے دیکھنے سے ہی اور اس کے تصور سے ہی خوف محسوس ہوتا ہے۔

قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار
"ضربِ کلیم"

الف: میں نے تم سے کچھ بھی تو نہیں مانگا، تمہیں اپنا نام تک نہ بتایا۔ جب تم چلنے لگے تو چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ اس کنوئیں کے پاس جہاں درخت کا ترچھا سایہ پڑ رہا تھا، میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ گھڑوں کو لبالب بھر کر ساری عورتیں اپنے گھر جا چکی تھیں، انہوں نے بلند آواز سے پکارا اور کہا: آؤ، چلو ہمارے ساتھ۔ دن بہت دوپہر ہوئی آ رہی ہے لیکن میں غفلت میں وہیں ٹھہر گئی اور منصوبے باندھنے لگی۔

؎ ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گُل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بُو کا

بانگِ درا

ب: جب تم آئے تب تمہاری آہٹ بھی سُن نہ سکی میں۔
جب تم مجھے دیکھ رہے تھے تب تمہاری آنکھوں میں اُداسی اور تمہاری آواز میں تھکاوٹ تھی جب تم نے دھیمی آواز سے کہا تھا: "او، میں پیاسا مسافر ہوں" تب اپنے بیدار خواب سے ایکدم چونک اٹھی اور اپنی صراحی سے تمہارے اوک میں پانی انڈیل دیا، اُدھر پتّے کھڑکھڑائے اور کوئل کہیں گہری تاریکی سے کوک پڑی اور سڑک کے موڑ سے ببول کی خوشبو اُڑ کر مہکنے لگی

؎ مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

ضربِ کلیم

ٹیگور اپنے معبود و محبوب کو اسکی عنایات کا پیاسا محسوس کرتا ہے حالانکہ انسان اسکے کرم کا طلبگار ہے اور ہر شے جو مشاہدات میں ہے، انسان کے تابع فرمان کر دی گئی ہے یہاں تک کہ گردشِ لیل و نہار کا سازگار بھی آدمی کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ٹیگور پتّوں اور کوئل کی آوازوں سے ہی متاثر ہو جاتا ہے۔

ج: جب تم نے میرا نام پوچھا تو شرم کے مارے میں بالکل کھڑی ہو گئی۔ ٹھیک ہی تو ہے میں نے تمہارے لئے کیا ہی کیا تھا کہ تم مجھے یاد رکھتے۔ لیکن تیرے دل میں یہ یادگار ہمیشہ قائم رہے گی۔ کہ میں پانی دے کر تمہاری پیاس بجھا سکی۔ اور یہی یادگار میری رُوح کو اپنی مٹھاس میں جذب کر لے گی۔

ہ نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

"بانگِ درا"

ٹیگور نے تو صرف اتنا ہی کیا کہ کسی پیاسے کو راہِ مولا پر پانی کے چار گھونٹ پلا دئے، اور اس احسان کو لوحِ قلب پر لکھ لیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں مسلمان نے خدا کی راہ پر کربلا جیسے میدانوں میں اولاد جیسی عزیز شے کو قربان کر دیا اور اس کا ذکر زبان تک نہ لائے کہ کہیں خدائے محبوب کی نگاہیں جھک نہ جائیں۔ یہ ہے عشق و وفا کی انتہا۔

۵: صبح کا وقت، قریب قریب بیت چکا ہے
اور پرندے تھکی آواز میں چہچہا رہے ہیں،
نیم کے پتے مرمر کر رہے ہیں، اور میں
سوچتی بچارتی یہاں ہی بیٹھی ہوں۔

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

بالِ جبریل

ٹیگور، زندگی کے ہر موڑ پر مقام چاہتا ہے اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ خود اس جنسِ افضل سے پیوست ہے، جس کے ہنگاموں سے دونوں عالم میں ہل چل مچی ہوئی ہے۔ اور یہ تمام مناظرِ قدرت، دیدۂ حیرت و استعجاب بن کر اس پیکرِ خاکی کے مطالعہ میں محو ہیں اور کچھ خبر نہیں پاتے۔

۵۵۔ الف: تیرے دل میں ابھی تک سستی ہے، نیند کا خمار
ابھی تک آنکھوں میں چھایا ہوا ہے کیا تو نے سنا
نہیں کہ پھول کانٹوں میں بڑے ٹھاٹھ سے رعب
جمار ہا ہے جاگو اے جاگنے والو! وقت کو بیکار مت
گذرنے دو۔ پتھریلے راستے کے اخیر کونے کے خاموش
دیش میں میرا دوست تنہا بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے
اُسے دھوکہ نہ دینا، اے جاگنے والو! جاگو!

نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا
اور تو منّت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا
"بانگِ درا"

ٹیگور کے نزدیک صرف جاگنے کا وقت طلوعِ آفتاب کا اوّلیں لمحہ ہی ہے وہ نہیں جانتا کہ رات کی تاریکیوں میں بھی نورِ خدا گرمِ تماشا رہتا ہے اور دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔

ب: کیا ہوا اگر آفتاب کی نیمروز تپش سے آسمان
کانپ اٹھے۔ کیا ہوا اگر تپتی ہوئی ریت مارے
تشنگی کے اپنا پیاسا لوک بڑھادے۔ کیا تیرے
دل کی گہرائی میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ کیا تیرے
قدموں کی ہر ایک آواز پر راستے کی اذیت آلود
بنسیا سے سریلے نغمے نہ چونک اٹھیں گے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں!
"بالِ جبریل"

جوانی اور عین جوانی میں محنت اور محنتِ شاقہ کا نام ہی زندگی ہے اور اسی عملِ پیہم اور سعیٔ مسلسل سے زندگی کی تلخیاں مٹھاس میں بدل جاتی ہیں۔

۵۔ الف: مجھی میں پوری طرح سے تمہاری خوشی جذب ہے، تبھی تو مجھ سے ملنے کے لئے تم نیچے اتر آئے ہو۔ اے مالکِ دو جہان! اگر میں نہ ہوتا تو تمہاری یہ محبت ہی کہاں ہوتی اپنے اس عیش و آرام میں تم نے مجھے اپنا حصّہ دار بنایا ہے، میرے دل میں تمہاری خوشی بے شمار مزے لیتی ہے اور میری زندگی میں ہمیشہ تمہاری ہی تمنائیں وجود حاصل کرتی ہیں۔

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

"بانگِ درا"

ٹیگور نے انفرادی یا اجتماعی زندگی میں اپنے پیارے معبود کی بقا کے لئے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ اسکے برعکس اقبالؒ نے انفرادی اور اجتماعی طور پر خدا کے کعبہ کو جبینوں سے آباد کیا اور اسکے محبوب پیغام کو سینوں سے لگائے رکھا۔

ب: اے شاہوں کے شاہ! تبھی تو میرے دل کو موہنے کیلئے تم نے خود کو خوبصورتی سے سجایا ہے اور اس لئے تو تمہاری محبت تمہارے عاشق کے عشق میں جذب ہو جاتی ہے اور تبھی دونوں کے پریم کے انتہائی اتحاد میں تمہارے جلوے کا ظہور ہوتا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

"بانگِ درا"

اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ محبت تو شے ہی کچھ نہیں اگر کوئی رسول اللہ صلعم کی محبت کو حاصل کرلے تو وہ کون و مکاں کی محبت کو خرید سکتا ہے، بلکہ کون و مکاں خود ایسے بشر کے طلب گار ہو جاتے ہیں۔

۵۷۔ الف: او نور! میرے نور! دنیا کو منوّر کرنے والے نور! بصیرت افروز نور! روح افزا نور! آہا میرے محبوب نور کا ہی رقص میری زندگی کا مرکز ہے۔ نور ہی میری محبّت کی بنسیا کو چھیڑ رہا ہے۔ مطلعِ انوار ہو رہا ہے۔ ہوا بے فکری میں بہہ رہی ہے۔ ساری دنیا قہقہوں سے گونج رہی ہے۔

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
"اقبالؒ"

ب: تتلی نور کے سمندر پر اپنے پنکھ پھیلاتی ہے۔ روشنی کی کرنوں پہ چڑھ کر کملنی اور نسترن جھولا جھول رہی ہیں۔ میرے محبوب روشنی کی کرن ہر ایک بادل پر سونے جیسی چمک کے ساتھ چمک رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے موتیوں کی بارش برس رہی ہے۔

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند، یہ تارا ہے، وہ پتّھر یہ نگیں ہے
ضربِ کلیم

ج: پتے پتے میں اُمنگ اور مسرت جھوم رہی ہے اور دریائے بہشت نے اپنے ہی کناروں سے اُمڈ کر خوشی اور مسرت کا سیلاب بہا دیا ہے۔

اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی!

۵۸۔ (الف) اُس خوشی کے تمام نغمے میرے آخری گیتوں میں سما جائیں
جس خوشی کے سہارے زمین اپنے بدن پر گھنی گھاس
کا پیراہن پہن کر خوش ہوتی ہے۔

عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تیری
بُلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا
ضربِ کلیم

یہاں پہنچ کر ٹیگور نے نیرنگیٔ فطرت کا گہرائی میں ڈوب کر مطالعہ کرنا شروع کیا ہے، اور یہی وہ ذوقِ تجسس ہے جس سے صاحبِ دید کی نظر میں ایک غیر محسوس قوتِ امتیاز آجاتی ہے۔

ب: جس خوشی کے سہارے زندگی اور موت دونوں
اس وسیع دنیا میں ناچتے گھومتے ہیں، اور
جس خوشی کی جھنکار اپنے قہقہوں کے ساتھ
زندگی کو جھنجھوڑتی ہے۔

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے
ضربِ کلیم

زندگی اور موت کا فلسفہ اس حقیقت کی بشارت دیتا ہے کہ ان دونوں چیزوں پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں ہے لیکن ٹیگور بیچارا ابھی ادا گونی میں اُلجھا ہوا ہے۔

ج: جو خوشی اذیت کے کھلے کنول پر آنسو بن کر
چُپ چاپ اُبھتی ہے، اور جو خوشی اپنے آپکو
سراپا دھول میں ملا کر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں
نکالتی۔

سُرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے؟
ضربِ کلیم

ٹیگور نے کنول کے پتے پر شبنم کا آنسو دیکھا، لیکن وہ ضربِ نامحسوس جو اس ننھے سے قطرے نے اس نازک پتے کے نرم سینے پر لگائی اور پھر جو حساس دل سے حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک مدھم سی آواز پیدا ہوئی، اُسے ٹیگور نہ سُن سکا۔

۵۹- الف: میرے محبوب، میں جانتا ہوں کہ یہ سنہرا نور جو درخت کے پتوں پر ناچ رہا ہے یہ بادل جو سُستی سے آسمان پر ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں اور میرے دماغ پر ٹھنڈا بوسہ دیتی ہوئی یہ ہوا سبھی تمہاری محبت کا نشان ہے ؎

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

بانگِ درا

فطرتِ ایزدی جسے ہم رُوح کہتے ہیں، یہی انسان میں بیدار رہتی ہے اور یہی رُوح مادہ چیز دل میں خاموش نظر آتی ہے۔ لیکن ٹیگور کو یہی چیز ہر مادہ شے میں تڑپتی دکھائی دیتی ہے حالانکہ یہ وہ نہیں ہے بلکہ بیرونی اثرات کا تاثر ہے جو سیماب کی سی بے تابی اختیار کر لیتا ہے اور جسے کم نگاہی رُوحِ ازلی سمجھ لیتی ہے۔

ب- جب صبح کی روشنی میری آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ تب میرا دل تمہارا پیغام پاتا ہے، تمہارا منہ میرے منہ پر جھکا ہوا ہے، تمہاری نگاہیں میری نگاہوں پر جھکی ہوئی ہیں، اور میرے دل نے تمہاری قدمبوسی کی ہے۔

اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

اقبال ؒ

ٹیگور پھر چکر کاٹ کر اپنے مرکز پر آ جاتا ہے یعنی مادہ پرستی کی طرف جھک جاتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں اسے اس کے مذہب سے ورا ثتہً ملی ہیں، جس کی حقیقت کو علم و تجسس کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی، یا خود تعصب کے فریب میں گم رہا۔ اقبال ؒ کے نزدیک آفتاب کی شعاعِ اوّلین پیامِ صبح کے سوا کچھ کام نہیں کرتی، اور یہ صبح بھی مومن کی اذان سے لرزاں ہے، جسے ٹیگور دیوتا کا رتبہ دے رہا ہے

۴۔ الف : عالمِ بیکراں کے سمندری ساحل پر بچے اکٹھے ہوئے ہیں۔ بیکراں آسمان خاموش ہے اور شوخ پانی ترنم بیز ہے۔ عالمِ بیکراں کے سمندری ساحل پر بچے اکٹھے ہو کر شور مچاتے اور ناچتے ہیں۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
ضربِ کلیم

ب : وہ ریت کے گھروندے بناتے ہیں۔ وہ خالی سیپیوں سے کھیلتے ہیں۔ سوکھے ہوئے پتوں کی ناؤ بناتے ہیں اور مسکراتے ہوئے انہیں گہرے پانی میں چھوڑ دیتے ہیں۔

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا وجود
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
ضربِ کلیم

ٹیگور ان طفلانہ تماشوں کا مطالعہ ضرور کرتا ہے لیکن ان کے بے نیاز مشاغل کی گہرائی تک نہیں پہنچتا۔ اقبال فطرت کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ اور پیکرِ انسانی کے لئے مشعلِ راہ بنتا ہے۔

ج : عالمِ بیکراں کے سمندری ساحل پر اس طرح بچوں کے کھیل ہوا کرتے ہیں، وہ تیرنا نہیں جانتے، جال پھینکنا بھی نہیں جانتے۔ موتی ڈھونڈنے والے

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا!
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا؟

موتیوں کے لئے غوطہ زن ہوتے ہیں۔

بیوپاری بیوپار کے لئے کشتیوں میں سفر
کرتے ہیں۔ لیکن بچے ہیں کہ کنکر چنتے
ہیں اور پھر انہیں بکھیر دیتے ہیں، پوشیدہ
خزانوں کی تلاش انہیں نہیں ہے، انہیں
تو جال بھی پھینکنا نہیں آتا۔

ٹیگور سمندر کی گہرائی میں صرف بیوپاری لوگوں کا ہی ایک ہجوم دیکھتا ہے۔
اور موتیوں کو پتھروں کی طرح خاموش پڑا پاتا ہے۔ لیکن اقبال کہتا ہے
کہ جس موتی کی موجودگی سے دریا کا دل بیتاب نہیں وہ موتی بھی اپنے اندر
کوئی جوہر نہیں رکھتا۔

ٹ: سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا امڈا پڑتا ہے اور
سنہری عکس ساحل کی مسکراہٹ کو دوبالا
کرتی ہے۔ بھیانک اور خوفناک لہریں بچوں
کو فضول قلقل کا نغمہ سناتی ہیں، جیسے
جھولا ہلاتے وقت ماں لوریاں دیتی ہے
اور دریا بھی بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

ا: ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں!
بانگِ درا

پانی کی مضطربانہ کیفیت کو ٹیگور کی سطح بین نگاہیں نہ پہچان سکیں، اور اسکے سینے
میں اتر کر تڑپ کی گہرائی کو نہ ناپ سکیں، یہ کام تو ایک صاحب قلب و نظر ہی کر سکتا ہے۔

ل: عالمِ بحراں کے سمندری ساحل پر بچوں کا ملاپ ہو رہا ہے، فلکِ بے راہ پر آندھی اور طوفان منڈلا رہا ہے، اور پانی میں گمراہ کشتیاں پاش پاش ہو رہی ہیں۔ چاروں طرف موت ہی کی حکومت ہے، لیکن بچے اپنے کھیل میں مست ہیں۔

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

بانگِ درا

ٹیگور بیچارا ہندو مذہب کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہاتھ پاؤں مارتا نظر آتا ہے، مادہ پرستی اسکے ذہن پر مسلط ہے۔ سطح بینی کے فریب میں اس کی نگاہیں گمراہ ہیں۔ وہ پانی کے تھپیڑوں میں سفینۂ حیات کو دیکھتا ہے، اور اس پر موت کی مُہر ثبت کر دیتا ہے۔ لیکن اقبالؔ اِس موت کو تبدیلیٔ مقام سے تعبیر کرتا ہے جو ایک حقیقت ہے۔

۱۶ - الف - کیا کوئی جانتا ہے کہ بچے کی آنکھ میں نیند کہاں سے آسماتی ہے - جی ہاں سنتے ہیں کہ جنگلوں کے گھنے سائے کے اندر جگنوؤں کی مدہم روشنی سے روشن پریوں کے کسی گاؤں میں جہاں وہ کومل من موہنی کلیاں جھومتی ہیں وہاں ہی ان کا وطن ہے - وہیں سے یہ بچوں کی آنکھیں چومنے آتی ہیں -

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقاب آگہی
ہے غبارِ دیدہ بینا حجاب آگہی

بانگِ درا

ٹیگور جسے نیند کہتا ہے اقبال اسی بے نیازی کو غفلت سے تعبیر کرتا ہے - ٹیگور ہر چیز کو سطحی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اقبال گہرائی میں ڈوب کر اس کا مطالعہ کرتا ہے -

ب - کیا کوئی جانتا ہے کہ نیم خواب بچوں کے ہونٹوں پر تھرکتی ہوئی مسکراہٹ کی جائے پیدائش کہاں ہے ہاں سنتے ہیں کہ مہ نو کی جوان اور شیریں کرن کسی اٹھتے ہوئے بھیگے ہوئے بادل کے کنارے سے چھو گئی - بس وہاں ہی پہلی بار سرخی افق میں صبح کے خوابِ لمحہ میں وہ مسکراہٹ عالمِ وجود میں آئی جو نیم خواب بچوں کے ہونٹوں پر آ کر تھرکتی ہے -

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

بانگِ درا

ج - کیا کوئی جانتا ہے کہ بچے کے ہر اعضائے جسم میں بیٹھا شگفتہ نور اب تک کہاں چھپا ہوا تھا - ضرور بچے کی ماں جب دوشیزہ ہی تھی تب بچے کے ہر

اعضائے جسم میں پھیلا ہوا یہ سریلا اور شیریں نورِ محبت کے نازک اور خاموش راز کے بھیس میں اس کی روح میں سمایا ہوا تھا۔

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے
بانگِ درا

۴۲۔ الف: پیارے بیٹے! جب میں تمہارے
لیے رنگ برنگ کے کھلونے لاتا ہوں ۵
تب میں سمجھ پاتا ہوں کہ بادلوں اور ندی
کے پانی میں اس قسم کے مختلف رنگین
جلوے کیوں؟ اور کیوں یہ پھولوں کا جھنڈ
اتنے رنگوں میں نقش کیا ہوا ہے؟

ب: جب میں گیت گا کر تمہیں نچاتا ہوں۔ ۵
اسی وقت مجھے دراصل پتہ چلتا ہے کہ
درختوں کے پتوں کی صرصر میں کیوں
نغمہ بھرا ہوا ہے، اور کیوں دریا کی لہریں
زمین کے دل کو اپنے مسلسل شور سے
گونجاتی رہتی ہیں؟

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو
"بانگِ درا"

دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
ضربِ کلیم

انسان کے لیے اقبالؒ کا یہ پیغام ہے کہ دنیا میں عملِ حیات سے ایسا کمال پیدا کیا جائے جس سے فطرت کا کمال پھیکا پڑ جائے۔ اور اپنے آرٹ میں ایسی خوبی رکھی جائے جس سے نیچرل آرٹ مدھم دکھائی دے۔ لیکن ٹیگور کو نیچرل آرٹ کی حرکات و سکنات میں ایسا کمال نظر آتا ہے کہ اُس کا اپنا جوہرِ کمال و ہنر خاموش ہو جاتا ہے۔

ج: جب میں تمہارے للچاتے ہوئے ہاتھوں کو
مٹھائی سے بھر دیتا ہوں تب مجھے معلوم
ہوتا ہے کہ کیوں پیالے جیسے پھولوں میں
شہد بھرا ہوا ہوتا ہے؟ اور کیوں پھلوں
میں میٹھا رس بھرا ہوا رہتا ہے؟

ے
گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو
بانگِ درا

ح: میرے پیارے تمہیں ہنسانے کے لئے
جب میں تمہارا منہ چومتا ہوں تبھی واقعی
میں جان پاتا ہوں کہ افق کی روشنی
میں آسمان کے راستے سے کیسی خوشی
بہتی ہے۔ وہ خوشی جس سے میرا جسم
بسنت کے ٹھنڈے جھونکے کے چھو
جانے سے حاصل کرتا ہے۔

ے
ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا
منزلِ عیش کی جا نام ہو زنداں میرا
بانگِ درا

الف : تم نے مجھے اُن دوستوں سے متعارف کرایا جنہیں میں جانتا نہ تھا، تم نے مجھے اُن گھروں میں بٹھایا جو میرے ذاتی نہ تھے۔ تم نے دُور کے ناطوں کو نزدیک بنا کر پرائے لوگوں کو بھی قریبی بنا لیا۔

پُرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھکو کہ ہو ابھی نوخیز
(بالِ جبریل)

ٹیگور اہلِ دُنیا کے مخصوص حلقہ سے مِل کر خوش ہے اور اجنبی لوگوں سے متعارف ہو کر سمجھتا ہے کہ یہی فطرت کا اعجازِ منظم ہے، لیکن اقبال کو دُنیا تو دُنیا، آسمانِ فرسودہ بھی پسند نہیں آتا وہ تو اپنے لئے ایک ایسا جہانِ تازہ چاہتا ہے جس میں کوئی شے بھی فرسودہ نہ ہو۔

ب : اپنی واقف جگہ کو چھوڑتے ہوئے میری رُوح کو اذیت پہنچتی ہے، میں اس خیال کو بھول جاتا ہوں کہ ہر نئی جگہ میں بھی تم ہی رہائش رکھتے ہو

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل
کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل
(بانگِ درا)

اقبال کے نظریہ کے مطابق آدمی کو لازم ہے کہ موت و حیات میں کوئی امتیاز نہ کرے اور لفظِ اجل کو تبدیلیٔ مقام پر وارد نہ کرے۔ اس لئے کہ روحِ انسان پر اجل حرام ہے۔ اجل جسم کے لئے ہے، پیکرِ خاکی کے لئے ہے، نورِ فطرت کے لئے نہیں اور جسے تبدیلیٔ مقام میں اذیت محسوس ہوتی ہو وہ پھر فلسفۂ موت و حیات کو سمجھتا ہی نہیں۔

ج : اس جہان میں یا اور کسی جہان میں زندگی اور موت کے سہارے جہاں کہیں بھی تم مجھے لے جاتے ہو، وہاں بھی تم میری لامتناہی زندگی کے ایک واحد ساتھی بن کر انجان لوگوں کے ساتھ محبت کے بندھن سے باندھ دیتے ہو۔

کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا بانگ درا

ٹیگور عالمِ ارواح کو ایک ان دیکھا اور بے پہچان دنیا تصور کرتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت انسان اسی عالم سے متعلق و وابستہ ہے اور وہاں پہنچ کر اسے سمجھنا چاہیئے کہ ایک مختصر سفر کے بعد وہ پھر اپنے وطن میں آگیا ہے، اور یہ دنیا وہی ہے جس سے وہ ایک عارضی وقت کے لئے چلا گیا تھا اور یہاں کی ہر شے اسکی پہچانی ہوئی ہے، بلکہ ہر شے سے اسکی فطرت مانوس ہے اور یہاں کے رہنے والے اُسکے احبابِ دیرینہ میں سے ہیں۔

ط : جو تمہیں کوئی سمجھ جاتا ہے تب اُسے کوئی بھی پرایا نہیں رہ جاتا۔ اُس کے لئے سب دروازے کھل جاتے ہیں۔ تم سے میری ایک التجا ہے کہ میں ہزاروں میں رہ کر بھی تیری ذاتِ واحد کو نہ بھول جاؤں۔ اے خدا میرے قبول فرما۔

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

رتبہ تیرا ہے بڑا شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری
بانگ درا

جہاں تک دعا کا تعلق ہے اسے احسن کہنے میں کلام نہیں لیکن یہ دستورِ قلندری کے خلاف ہے، وہ بشر ہی کیا، جسے اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو، اور وہ ایمانِ محکم نہ رکھتا ہو یا اُس کے تخیلات میں ایک کشمکش رہے۔ اور اس کی قوتِ اعتمادی میں سیمابی نقص موجود ہے مومن تو وہ ہے کہ جو سمندر میں رہ کر بھی دامن تر نہ ہونے دے، اور پرواز میں بھی نگاہ نشیمن سے الگ نہ ہو۔ دنیا کے اس کنارے سے کنارے تک چلا جائے، لیکن اپنے مرکز سے باہر نہ جا سکے۔ بحرِ علوم و فنون میں غوطہ زن ہو، مگر معبودِ حقیقی کے تصور سے غافل نہ رہے۔

الف: ندی کے سنسان کنارے کی گھنی گھاس میں
مَیں نے اُس سے پوچھا: دوشیزہ! اپنے
دامن تلے چراغ کو لئے کدھر جا رہی ہو؟
میرے گھر میں تاریکی اور خاموشی مسلّط
ہے اپنا چراغ مجھے ہی دے دو۔ لمحہ بھر
اپنی سیاہ آنکھیں اوپر اٹھاؤ۔

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

بانگِ درا

شام کی تاریکی میں میری طرف دیکھ کر
وہ بولی کہ نورِ آفتاب کے گوشۂ مغرب
میں غروب ہونے پر ندی میں اس
چراغ کو بہا دینے کے لئے میں یہاں
آئی ہوں۔ اس گھنی گھاس میں اکیلا
ہی مَیں ندی میں فضول ہی بہتے ہوئے
اسکے ناپائیدار چراغ کی لَو کو کھڑا کھڑا
دیکھتا رہا۔

ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام
بہشتِ دیدۂ بینا ہے حُسنِ منظرِ شام

بانگِ درا

ٹیگور غروبِ آفتاب کی سُرخیوں کو بے معنی اور فضول سی چیز سمجھتا ہے، لیکن اقبال اسی نظارہ کو بہشت سے تعبیر کرتا ہے، لیکن دیدۂ بینا کے لئے، اور یہی وہ جوہر ہے جس کی نگاہِ ٹیگور میں کمی ہے۔

۴۳ : بڑھتے ہوئے اندھیرے کی خاموشی میں میں نے اُس سے پوچھا: نازک اندام! تمہارے گھر کے سبھی چراغ تو جل رہے ہیں پھر اس چراغ کو لے کر کہاں جا رہی ہو؟ میرے گھر میں انتہائی تاریکی اور خاموشی ہے اپنا چراغ مجھے دے دو، تب اپنی سیاہ آنکھوں سے لمحہ بھر کیلئے میری طرف دیکھ کر مشکوک نگاہ سے بولی میں تو اپنا چراغ آسمان کی نذر کرنے لائی ہوں۔ سنسان آسمان پر اس بے مطلب جلتے ہوئے چراغ کو میں وہیں کھڑا کھڑا دیکھتا رہا۔

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور ہوں
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

بانگِ درا

۴۴ : اندھیری راتوں کی نصف شب کے گہرے اندھیرے میں میں نے اُس سے پوچھا، اپنے دل سے چراغ کو لگا کر تم کس کی تلاش میں ہو؟ میرا گھر تاریک اور خاموش پڑا ہے: از راہِ کرم اپنا چراغ مجھے ہی عنایت کر دو پل بھر کیلئے وہ ٹھہری، اور پھر کچھ سوچ کر اندھیرے میں میری طرف آنکھیں اٹھا کر وہ بولی: چراغوں کی مالا میں سجانے کیلئے ہی اس چراغ کو میں یہاں لائی ہوں۔ دوسرے چراغوں کے جھنڈ میں فضول ہی اُس چراغ کو جلتے ہوئے میں دیکھتا رہا۔۔

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟
انجم نہیں تیرے ہمنشیں کیا؟

بانگِ درا

یہ بات واضح ہو گئی کہ ٹیگور کا اندرون تاریک اور خاموش تھا، اور وہ دُوسروں کے نورؒ کی روشنی کا طالب تھا جو اُسے نہ مل سکی۔ اور وہ اپنی نظر میں دُوسروں کی روشنی کو بے محل اور بیکار سمجھتا رہا، اور اپنے اندر نورِ بصیرت پیدا کرنے کی سعی نہ فرمائی۔ حالانکہ انسان سراپا نور اور دیگر انوار و تجلیات پر صاحبِ قدرت ہے۔

۷۔ الف: میری زندگی کے مالک! میرے خدا! تم میری زندگی کے لبریز پیمانے سے کون سا رس پینا چاہتے ہو؟

نہ کر دیں مجھکو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے
بالِ جبریل

اقبالؔ اسی رس کو نوائے اندروں سے تعبیر کرتا ہے اور خدا کو دعوتِ نوش نہیں دیتا، بلکہ تنبیہہ کرتا ہے کہ کہیں دبی ہوئی چنگاریاں سلگنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔

ب: میرے شاعر! کیا میری ہی آنکھوں سے اپنی کائنات کا مطالعہ کرنے اور میرے ہی کانوں کے ذریعے اپنے خیالی نغمے کو سننے میں مزہ آتا ہے؟

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے
بانگِ درا

ج: تمہارا ہی یہ جہان، یہ دُنیا، میرے لفظوں کا تانا بانا بُن رہی ہے اور تمہارا ہی سرود دائم الفاظ میں نغمے پیدا کر رہا ہے۔ تم چاہت کے تبضے میں اپنے آپ کو مجھے ہی سپرد کر کے مجھ میں ہی اپنی پوری مٹھاس کا تجربہ کرتے ہو!

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گُل ہوں میں خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری
بانگِ درا

۲- الف: شام کے دھندلکے میں جو ہمیشہ میرے دل میں چھپا رہا ہے اور جو نور افق میں بھی کبھی بے نقاب نہیں ہوا، اے خدا وہی میرے گیت کا آخری انعام ہو۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
بانگِ درا

ٹیگور کے دل پر تاریکئ شام مسلط ہے اسلئے اُس بیچارے کو راستہ دکھائی نہیں دیتا اور اسکے برعکس اقبالؒ کا قلبِ منوّر مثلِ آئینہ ہے جو اسے دو جہان کے راز سے آگاہ کرتا ہے چنانچہ اقبالؒ کا کلام اُس کے مشاہدات کی تفسیر ہے۔

ب: اسے میں اپنے دل میں چھپائے ملک در ملک گھومتا پھرا، اور وہی میری زندگی کے دکھ سکھ کا مرکز بنا رہا۔

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دوربیں ہم نے
بانگِ درا

بقول اقبالؒ قوّتِ کشش اپنے ہی اندر مضمر ہوتی ہے اور جو اِس راز سے باخبر ہو گیا وہ اپنی قوّتِ نگاہ کے اثر سے ہر شے کو اپنے قریب لا سکتا ہے۔

ج: میرے خیالات، کاروبار، نیند اور خواب پر اس نے ہی راج کیا ہے لیکن پھر بھی وہ اکیلی اور الگ رہی بہت سے لوگوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سب کو ناامید لوٹنا پڑا۔

خزینہ ہوں، چھپایا مجھکو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں
بانگِ درا

د: دنیا بھر میں ایسا کوئی نہیں ہے جس سے اس کا مقابلہ ہوا ہو، وہ تو ہمیشہ تمہاری انتظارِ اجازت میں تنہا بیٹھی رہی۔

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہانتاب نہ کر ہم کو فراموش!
ضربِ کلیم

۱۷۔ (الف): تم آسمان بھی ہو، تم آشیاں بھی ہو اے نورِ
پوشیدہ، اسی آشیانے میں تمہاری ہی محبت نے
میری روح کو بے شمار رنگ روپ خوشبوؤں
اور نغموں سے گھیرا ہوا ہے۔

(ب): ملکۂ افق اپنے دائیں ہاتھ میں سونے کے تھال
میں مالائے حسن لئے چپکے چپکے ارضِ مقدس
کے سنگھار کے لئے آتی ہے۔

(ج): لیلیٰ شام بھی بے پرند خاموش میدانوں
اور مشکل راستوں کو پار کرتی ہوئی اپنی سنہری
گاگر میں امن جین کے مغربی سمندر کا ٹھنڈا
اور خاموش جل لئے یہاں آجاتی ہے۔

(د): وہاں جہاں پھیلے ہوئے عرشِ بیکراں
میں روح کی پرواز کا مقام ہے، نورانی
اور نازک روشنی پھیلی ہوئی ہے، نہ تو وہاں
دن ہے نہ رات، نہ رنگ ہے نہ روپ
نہ ہی کوئی آواز ہے۔

؎ یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں

ضربِ کلیم

؎ صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیرِ خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

بانگِ درا

؎ فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کی سو گئی ہے
تاروں کا خاموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے

بانگِ درا

؎ نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیری

بانگِ درا

۶۰۔ الف: تمہاری آفتابی شعاع اپنے لمبے ہاتھ پھیلائے
میری اس زمین پر آ کر میرے دروازے پر
دن بھر میرے انتظار میں کھڑی رہتی ہے۔
کہ میرے آنسوؤں، آہوں اور گیتوں سے بنے
ہوئے بادلوں کو دوبارہ تمہارے قدموں میں
لے جائے۔

نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر
کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر

بانگِ درا

بالکل سائنس کے سطحی اصولوں کے مطالعہ کے پیشِ نظر ٹیگور مہرِ جہاں تاب میں پانی کو جذب کرنے کی قوت دیکھتا ہے اور اسکے علاوہ کچھ نہیں لیکن اقبالؒ کے نزدیک یہی ضیا چشمِ ظاہر کو نورِ بصیرت عطا فرماتی ہے۔

ب: لگاؤ اور خوشی سے تم اپنے تاروں سے جڑے
ہوئے سینے پر دھندلے بادلوں کے پردے
کو لپیٹ کر اس سے بے شمار جلووں کو روزانہ
تبدیل کرتے ہو۔

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

بانگِ درا

ج: اے نورِ مجسم! اے جلوۂ خاموش! یہ بادل کتنے ہلکے
پھلکے، بیتاب، نازک اور کتنے لبریز اور سیاہ؟
ہیں تبھی تو تم ان سے اتنا پریم کرتے ہو، اور
تبھی تو تمہارے نورِ درخشاں کو یہ اپنے
محبوب سائے میں لے لیتے ہیں۔

سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قُم ہم نے
غنچۂ گل کو دیا برقِ تبسم ہم نے۔

بانگِ درا

۶۹۔ الف : وہی آبشارِ حیات جو دن رات میرے راستوں
سے بہتی رہتی ہیں، دنیا بھر میں بہہ رہی ہیں۔
اور سُریلے نغموں کے ساتھ رقص فرما ہیں
یہ وہی زندگی ہے جو زمین کی دھول میں سے
بے شمار تنکوں کی شکل میں نمود پاتی ہے، اور
پھولوں اور پتّوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے!
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
بانگِ درا

ب یہ وہی زندگی ہے جو بحرِ حیات و ممات میں
مد و جزر کے جھولے میں ہچکولے لیتی ہے
مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وجود اس بیداری
کے چھو جانے سے جو دنیا میں پھیلی ہوئی ہے
چونک اُٹھتا ہے۔ اپنے خون میں اس وقت
بھی صدیوں کے احساسات و تجربات کا خیال
کر کے مغرور ہو رہا ہوں۔

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
بانگِ درا

۷۔ الف: تال اور سنگیت کی خوشی سے تم کیا خوش نہیں ہوتے ہو، خوشی اور مستی کے بھنور میں لوٹ لوٹ ہو کر خود کو کیا بھول نہیں جاتے ہو۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لاالٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے!
اگر دیکھیں فروغِ مہر و ماہ سے
ارمغانِ حجاز

ہندو دھرم کا عقیدہ ہے کہ دیوتا گیت اور ناچ سے خوش ہوتے ہیں چنانچہ وہ مذہبی طور پر دیوتاؤں کی مورتیوں کے سامنے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے تال اور سنگیت کے جوہر پیش کرتے ہیں۔ اس سطحی نظریہ کے پیشِ نظر بگور اپنے معبود سے پوچھ رہا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ مٹی اور پتھر کی مورتیاں کسی قوت کی مالک نہیں ہیں اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ہر ذرہ میں معبودِ حقیقی کا ہی نور مضمر ہے تو پھر مجموعۂ ذرات کے خود ساختہ ڈھانچے کو کیوں مخصوص سمجھا جائے پھر یہ کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ:-

"جہاں روشن ہے نورِ لاالٰہ سے"

ب: تمام چیزیں سرعت سے بڑھتی جا رہی ہیں، وہ رکتی نہیں اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں، وہ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہیں، کوئی طاقت بھی انہیں نہیں روک سکتی۔

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
بالِ جبریل

ج: باس بیتا بید نغمے کی لے پر ہر موسم ناچتا آتا ہے اور چلا جاتا ہے، طرح طرح کے رنگ، انگ اور خوشبو کے بے شمار جھرنے اس خوشی میں آ آ کر گرتے ہیں اور ہر لمحہ کے بعد ختم ہوتے رہتے ہیں۔

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی کوہکن بھی ہے
بانگِ درا

۱۷۔ الف: خدایا! یہ تیرا کرشمہ ہے کہ جس کے ماتحت میں اپنے غرور میں تمہارے نور کو اپنے وجود میں جذب کر کے ہر سمت سر بلند پھرتا ہوں

ہے تیرے نور سے وابستہ میری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

بانگِ درا

ب: خود ہی تم اپنے آپ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مختلف ناموں سے پکارتے ہو اور تمہارا یہی اندازِ تقسیم میرے جسم میں آکر انسان کی شکل و صورت اختیار کر گیا ہے۔

تیرا کمال ہستی ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

بانگِ درا

ج: دلفریب نغموں، رنگ برنگ آنسوؤں، تبسّم اور تمناؤں کے جلووں میں جلوہ گر ہو کر سارے آسمان پر گونجتے ہیں، لہریں اٹھ اٹھ کر رہ جاتی ہیں، خواب آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میرے اندر جو تمہاری روح مقیّد ہے یہ اُس کی ہار ہی تو ہے۔

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی!
خطا کس کی ہے یا رب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

د: کائنات کے اس پردے پر دن اور رات کے برش سے تُو نے ہزاروں قسم کے نقش بنائے ہیں، اسکے پسِ پردہ تیرا عجیب اور پوشیدہ تخت بنا ہوا ہے۔

چھپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے!
وہی نازآفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

ل : تمہارے اور میرے وصال سے آسمان
سج رہا ہے۔ تمہاری اور میری سُر سے
ہوا گونج رہی ہے۔ تمہاری اور میری آنکھ
مچولی میں ہی زمانے پر زمانے گذرتے
جاتے ہیں۔

حقیقت اپنی آنکھوں پہ نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

بانگِ درا

۲۔ (الف): وہی تو رُوحِ حقیقی ہے جو میری رُوح کو ضربِ خفیف سے بیدار کرتی ہے۔

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق!
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود (بالِ جبریل)

ٹیگور نے جو اس حقیقت کا اعلان فرمایا ہے کہ اُس کی رُوح کو رُوحِ حقیقی نے بیدار کر دیا تھا، غلط ہے کیونکہ وہ تادمِ مرگ صاحبِ حقیقت نہ ہو سکا اور ہندو مت کے عقائد کے زیر و بم میں پریشان رہ کر عمر ختم کر گیا لیکن اقبالؒ نے بجا طور پر فرمایا ہے جس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

ب: وہی ہے جو ان آنکھوں پر اپنا دلفریب جادو ڈال کر میرے سازِ قلب کو چھیڑ کر دکھ سکھ کے طرح طرح کے نغمے پیدا کرتی ہے۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ "بالِ جبریل"

جب ٹیگور کے سوز و ساز پر ضرب پڑتی ہے تو اس سے دکھ اور سکھ کے نغمے پیدا ہوتے ہیں اور جب اقبالؒ کے سازِ تخیل پر چوٹ پڑتی ہے تو اس سے رازدارانہ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

یہ ہے ان دو بڑے شاعروں میں امتیازی خصوصیت۔

ج: وہی تو ہے جو کہ سنہرے، روپہلی، ہرے، نیلے رنگوں کے تانے بانے سے اپنا مایا جال بناتا ہے۔ اس کے قدموں کی صرف جھلک ہی سوراخوں میں سے نظر آتی ہے جس کے نیاز حاصل کر کے میں اپنے آپ میں کھو جاتا ہوں۔

تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل (بالِ جبریل)

د: زمانہ پر زمانہ گذر رہا ہے لیکن وہی تو ہے جو میری رُوح کو مختلف ناموں، جلووں اور غم و مسرت کے چکر میں نچاتا رہتا ہے۔

اُس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اسکے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل (بالِ جبریل)

۲۔ الف: سب کچھ ترک کر کے بھی مَیں نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ خوشی کے طرح طرح کے بندھنوں میں ہی مَیں نجات کے تصوّر کو محسوس کر سکتا ہُوں۔

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تُو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

ضربِ کلیم

عام نظریہ کے ماتحت غمِ مرگ کی حد مقامِ مرگ پر ختم ہو جاتی ہے اور یہی تصوّر ٹیگور کو بھی گمراہ کئے ہوئے ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس جہانِ پُر غم سے آنکھ بند کر لینے میں وہ دورِ مسرت کا آغاز ہوتا ہے اور اسی محسوسات سے وہ خوش ہے حالانکہ رُوح کو کسی مقام پر بھی قضا نہیں چھو سکتی، البتہ یہ پیکرِ خاکی پریشان ضرور ہو جاتا ہے۔

ب: ساغرِ ارضِ نما کو تم اپنے معطر اور رنگ برنگ کی شرابِ شیریں سے لبریز رکھتے ہو۔ میری یہ کائنات، سینکڑوں مختلف چراغ تمہارے نور سے روشن کر کے، تمہارے ہی مندر کی چوکھٹ پر بھینٹ کر دیتی ہے۔

تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نُور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

بالِ جبریل

ج: نہیں، کبھی نہیں، مَیں اپنی قوّتِ تخیّل کے دروازے کبھی بند نہیں کروں گا۔ الفاظ، جلوے محسوسات، ان سب کی مسرتوں میں، تمہاری ہی خوشی حاصل کروں گا۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مِرے آئینۂ ادراک میں ہے

بالِ جبریل

د: یقیناً میرے تمام شکوک، نُورِ مسرت کے شعلوں میں جلوہ گر ہوں گے اور میری تمام آرزوئیں محبت کے میٹھے پھلوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

تجھ سے میری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی میری آرزو، تُو ہی میری جستجو

بالِ جبریل

۴۷۔ الف: دن کے دمِ واپسیں پر فضا میں تاریکی پھیلنے لگی، ندی پہ جاکر گاگر بھرنے کا وقت ہو چکا ہے

عدم کا قافلۂ روز تیز گام چلا!
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا
بانگِ درا

ب: ندی کے پانی کے دردانگیز نغمے سے ہوائے شام پریشاں ہے، باہر اندھیرے میں مجھے بلانے کے لئے تمنائی ہے، راستہ سنسان ہے، کوئی بھی راہگیر نظر نہیں آتا، ہوا چل رہی ہے۔ ندی میں لہریں اُٹھ رہی ہیں۔

فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
ضربِ کلیم

قُدرت کے خاموش جلووں میں بھی انسان کے لئے دعوتِ نظر ہے، بشرطیکہ وہ دیدۂ بیدار رکھتا ہو ٹیگور کا فکر تار و تاریک، اس کا عمل عامیانہ، اُس کا تخیّل سطحی اور محض شاعرانہ، اس کی نگاہ بے نُور۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی منزل تاریکیوں میں گُم اور راہِ منزل اندھیرے میں بے نشان ہے، وہ صرف محسوسات سے کام لے سکتا ہے۔

ج: مجھے خبر نہیں کہ میں واپس گھر بھی جا سکوں گا، یا نہیں؟ نہ جانے آج کس سے ملاقات ہو جائے؟ وہاں گھاٹ پر ایک چھوٹی سی ناؤ میں بیٹھا ہوا کوئی نامعلوم بنسری بجا رہا ہے۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
ضربِ کلیم

ٹیگور اس دنیا میں آکر ایسی تاریکی میں کھو گیا ہے کہ ان عمیق گہرائیوں سے نکلنا غیر ممکن ہو گیا ہے، اُس کی نگاہ اُس روشنی تک نہیں پہنچ سکتی، جہاں سے راستہ نظر آجاتا ہے اور نہ ہی اس کی نگاہ بذاتِ خود نورِ اکسیر بن سکتی ہے جس سے کہ تاریکیاں منوّر ہو جاتی ہیں۔ اسکے تصوّر کی انتہائے پرواز اسکے تخیلی کرشن سے ٹکرا جاتی ہے اور بس۔

۷۵ - الف: ہمیں نذر کئے ہوئے تمہارے یہ سب تحفے ہماری سب ضروریات کو پورا کر کے پھر ویسے کے ویسے ہی تمہارے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل — بانگِ درا

ب: کھیتوں اور گاؤں میں سے ندی تیز رفتار سے بہتی رہتی ہے اور اپنے روزمرّہ کام کو پورا کرتی رہتی ہے، لیکن اس کی بے منزل دھار تمہاری ہی قدمبوسی کے لئے آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔

مَیں اچھلتی ہوں کبھی جذبۂ کامل کیلئے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل کیلئے
ہوں وہ رہرو کہ محبّت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں مَیں
وُسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں مَیں — بانگِ درا

ج: پھول اپنی مہک سے فضا کو معطر کرتے رہتے ہیں لیکن آخری خدمت میں خود کو تمہارے قدموں کی نذر کر دیتے ہیں۔

پھرا مَیں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں:
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں — ضربِ کلیم

ٹیگورؔ کے نزدیک پھولوں کا کھلنا، دیوتاؤں کی نذرِ عقیدت کی خاطر ہے اور مرجھا جانا اظہارِ وفا ہے لیکن اقبالؔ ان پھولوں میں سے کسی کو بھی عشق میں بیتاب، محبت میں صاحبِ جنوں اور ذوقِ نیاز میں سراپا جستجو نہیں دیکھتا

ح: تمہاری عبادت سے دنیا کچھ بھی غریب نہیں ہوتی شاعر کے شاعرانہ لفظوں سے لوگ اپنی ہمت کے مطابق خیال لیتے ہیں لیکن آخر میں سبھی کے خیال تم پر ہی مرکوز ہو جاتے ہیں۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دُنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے — بانگِ درا

۷۔ الف : اے میری زندگی کے مالک! کیا ہر روز ہاتھ جوڑے میں اس آسمان کے نیچے تیرے حضور میں کھڑا ہی رہوں گا؟

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام! ضربِ کلیم

وُہ جو واقفِ خودی نہ ہوں - وُہ جو آشنائے مقامِ خودی نہ ہو اور وُہ جو آگاہ مرتبۂ بشر نہ ہو عبادت میں کبھی صاحبِ جلال و جمال نہیں ہو سکتا۔

ب : کیا میں اس عرشِ بے کراں کے نیچے خاموش دل لے کر گوشۂ تنہائی میں کھڑا ہی رہوں گا۔

فقر جنگاہ میں بے سازو یراق آتا ہے!
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے ذوقِ سلیم
اسکی بڑھتی ہوئی بیباکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم ضربِ کلیم

ج : کیا میں بے انتہا محنت اور تقاضوں سے دُکھی تمہارے اس جہانِ کاروبار میں اور انسانوں کی آمدورفت کے جھنڈ میں کھڑا ہی رہوں گا۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم ضربِ کلیم

جب تک عشق میں آنکھ پُرنم نہیں ہوتی ان خالی آہوں سے محبوب کا دل گداز نہیں ہو سکتا۔

د : اے شاہوں کے شاہ جب اس دنیا میں سب کام ختم ہو جائیں گے تو بغیر بدلے کیا تمہارے حضور میں کھڑا ہی رہوں گا؟

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم!
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

"الف: مَیں تمہیں اپنا مالک مانتا ہُوں، اسلئے
تم سے دُور رہتا ہُوں، مَیں تجھ میں اپنا
پن نہیں دیکھتا ہُوں، اس لئے تمہارے
نزدیک نہیں آتا ہُوں۔

افلاک سے ہے اسکی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں!
جبرئیل و اسرافیل کا صیاد ہے مومن

ضربِ کلیم

ٹیگور کو یہ معلوم نہیں ہے کہ محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب آقا و غلام۔ بندہ و بندہ نواز میں کچھ تمیز نہیں رہ جاتی، بشرطیکہ محبت ہو۔ اور پھر بشر تو کون و مکاں کا وارث ہے، اگر وہ خود ہی اپنے مقام کے نزدیک نہ آئے تو قصور مقام کا نہیں ہے۔

ب: میں تمہیں پتا سمان سمجھتا ہوں، اور
تمہارے قدموں میں سرنگوں ہوتا ہوں
تبھی تو تمہیں اپنا دوست مان کر تمہارے
ہاتھ کا سہارا نہیں لیتا ہُوں۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اسکو سیار کر

بالِ جبریل

ٹیگور کسی کا احسانمند نہ ہونے کی خاطر اپنے معبودِ پاک کو بھی عام محسنوں جیسا تصور کرتا ہے ۔ جو احسان کر کے احسان یاد رکھتے ہیں ۔ حالانکہ یہ حقیقت ایزدی سے بعید ہے ۔ اسکے برعکس اقبال جو اپنے مولا کی نیچر کو سمجھتا ہے، اس سے معاونت کا طلب گار ہے، کیونکہ مدد اسی سے طلب کی جا سکتی ہے ۔

ٹ : جہاں تم میری طرف نیچے اتر کر مجھے اپنا بنا سکو، وہاں میں تمہیں اپنا ساتھی بنانے اور اپنے دل سے لگانے کے لئے حاضر نہیں ہوتا ہوں ۔

ا : میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی
بالِ جبریل

ٹ : میرے سب بھائیوں میں فقط تمہیں ایک بھائی ہو، اور ان بھائیوں کی طرف میں خیال بھی نہیں کرتا ہوں ۔ اپنی پیدا شدہ دولت میں سے انہیں کچھ بھی نہ دے کر سب کچھ تیرے اور اپنے درمیان بانٹ لیتا ہوں

ا : اُمنگیں مری آرزوئیں مری
اُمیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لُٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے
بالِ جبریل

ٹیگور کی بخیلی آپ کے سامنے ہے، اور اسکے برعکس اقبال کی فیاضی اور فیاضی کی اُمنگ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت کی طرح بے نقاب ہے ۔ اقبال بیتاب ہے کہ اس کا سرمایۂ حیات انسانوں کے حلقے میں تقسیم کر دیا جائے، تاکہ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکے ۔

ل: لوگوں کے دکھ سکھ میں شامل نہ ہو کر تمہارے ہی قدموں میں حاضر رہتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کی قربانی کرنے میں ہچکچاتا ہوں، اور بھری زندگی میں غوطہ زن نہیں ہوتا ہوں۔

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقرِ رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

ضربِ کلیم

خدمتِ خلق سے آنکھ چرانا از خود ایک گناہ ہے۔ جیسے راہب لوگ ثواب سمجھتے ہیں، ٹیگور بھی اس زاویۂ نگاہ کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک رہبانیت کمالِ حیات ہے اور پھر سکوں پرستی وجۂ تسکین ہے۔ حالانکہ محشرِ طوفان ہی انسان کی شان کے شایاں ہے۔ جو ایک نعمت ہے۔ اور یہ نعمت کردار کے غازیوں کو عطا ہوتی ہے۔

الف: جب عالمِ ایجاد کا ظہور پہلی بار ہوا تھا اور آسمان کے سب ستارے اپنی پہلی منوّر روشنی کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ تب قدسیوں نے ایک بزم قائم کی اور کہا: آہا! یہ نورِ مقدس کی تصویر کیسی حسیں ہے کیسی پاکیزہ اور مسرّت بخش ہے۔

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی
تبسّم فشاں زندگی کی کلی تھی
سیاہ پیرہن شام کو دے رہے تھے
ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گُل کو پہلے پہل آ رہی تھی
زمیں کو تھا دعوٰے کہ میں آسماں ہُوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہُوں

بانگِ درا

ب: لیکن اُن میں سے ایک نے اچانک کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس مالائے نور میں کوئی جگہ خالی رہ گئی ہے، کوئی ایک ستارہ کھو گیا ہے

رہنے دو جستجو میں خیالِ بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو

بانگِ درا

ج: انکی بنسیا کے سنہری تار بکھر گئے۔ گانا بند ہو گیا اور سب مایوس ہو کر چلّا اٹھے کہ وہی کھویا ہُوا ستارہ سب سے افضل تھا اور وہی ساری جنّت کا قابلِ ناز چراغ تھا۔

تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطّار تھا

بانگِ درا

ک: اُس دن اُس ستارے کی بہت تلاش ہوتی رہی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہی کہتے ہیں کہ اس کے کھو جانے سے کل کائنات کا امن ابتر ہو گیا ہے۔

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو

مہرِ روشن چھپ گیا اُٹھی نقابِ روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام

بانگِ درا

ل: صرف رات کی گہری خاموشی میں ستارے مسکراتے ہیں اور آپس میں دھیمے دھیمے کہتے ہیں یہ تلاش بالکل فضول ہے کیونکہ ہر سمت تکمیلِ ناشکستہ چھائی ہوئی ہے۔

آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

بانگِ درا

الف : اگر اس زندگی میں تمہارے نیاز حاصل کرنا میرے مقدر میں نہیں تو میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہوں گا کہ میں تمہارے نیاز سے محروم رہ گیا ہوں۔ اور میں اسے ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ کروں گا سوتے جاگتے ہمیشہ ہی اس تکلیف کی خلش میرے دل میں قائم رہے گی۔

ب : جیسے جیسے دنیا کے بھیڑ بھرے بازار میں میرے دن گذرتے جائیں، اور جیسے جیسے ہر روز کے منافع سے میری جھولی بھرتی جائے ویسے ہی مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں پایا۔ میں اسے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھول سکوں سوتے جاگتے ہمیشہ اس تکلیف کی خلش میرے سینے میں قائم رہے۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِّ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

بالِ جبریل

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

بالِ جبریل

۷: تھکا ہوا ہانپتا ہوا جب میں سڑک کے کنارے بیٹھ جاؤں اور زمین پر دھول میں ہی بستر لگاؤں تو ہمیشہ میں یہی محسوس کروں کہ ابھی مجھے بہت دور چلنا ہے، اور میں اسے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھول سکوں۔ سوتے جاگتے ہمیشہ ہی اس تکلیف کی تلاش میرے سینے میں قائم رہے۔

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

بالِ جبریل

۸: جب میرا گھر سجا ہوا ہو اور نغموں اور مسرت آمیز قہقہوں سے بھرپور ہو، تب بھی میں ہمیشہ یہی محسوس کروں کہ میں نے اپنے گھر میں تمہیں دعوت نہیں دی، اسے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھول سکوں۔ سوتے جاگتے اس تکلیف کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرتا رہوں۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

بالِ جبریل

۸۰۔ الف: اے میرے ہمیشہ چمکنے والے آفتاب! میں موسمِ سرما کی اس چھوٹی سی بدلی کی طرح ہوں جو بے مقصد ہی فضا میں گھومتی پھرتی ہے۔ بغیر تمہارے چھونے سے میری بھاپ ابھی تک پگھلی نہیں ہے اور وہی تمہاری روشنی میں جذب ہونے پائی ہے۔ اس طرح تم سے بچھڑ کر میں اپنے مہینے اور سال گن گن کر کاٹ رہا ہوں۔

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی نظر کے دیکھ

بالِ جبریل

ب: اگر تمہاری ایسی ہی خواہش ہے، یہی کھیل تمہیں پیارا ہے تو تم میرے اس نامکمل انسانی وجود کو مسخ کر دو اس کا پیراہن سنہرا بنا کر اسے شوخ ہوا میں بہنے دو۔ اور اس میں نت نئے کرشمے پیدا کر دو۔

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار!
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس!
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس!

بالِ جبریل

ج: اور پھر جب انہیں ضرورت محسوس ہو رات کے حصّے میں اس کھیل کو ختم کرنے کی تو میں گداز ہو جائیں اور میں تاریکی میں گم ہو جاؤں یا پھر اس میں بوقتِ سحر خوشبو پیدا ہو اور وہ بادِ نسیم میں گھل مل جائے۔

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

بالِ جبریل

۸۱۔ الف: غفلت میں وقت کھو دینے سے مجھے بہت دکھ
محسوس ہوتا ہے، لیکن میرے مالک! میرا وقت
تو کبھی برباد ہی نہیں ہو سکتا، میری زندگی کا ہر
لمحہ تمہاری ہی خواہش پر منحصر ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟
بالِ جبریل

ہمارا شاعر (اقبالؒ) تابعِ تقدیر ہو جانے کو کم ہمتی کی دلیل سے منسوب کرتا ہے اور انسان کو سبق دیتا ہے کہ اپنے تئیں اتنا بلند کر لو کہ تقدیر تمہاری محکوم بن کر رہ جائے۔

ب: ہر شے کے اندر جذب ہو کر تم ہی تو تخم کی
صُورت اختیار کر کے روئیدگی حاصل کرتے
ہو، کلیوں میں پھول، اور پھولوں میں پھل پیدا
کرتے ہو۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجُود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجُود
بالِ جبریل

ج: میں تھک کر سُستی سے بچھونے پر لیٹا
ہُوا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ سبھی کام
ختم ہو چکے ہیں لیکن جب میں صبح اُٹھا تو
دیکھا کہ میرا چمن طرح طرح کے تعجب انگیز
پُھولوں سے بھرا پڑا ہے۔

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
بالِ جبریل

۸۲۔ الف : میرے مالک، تم غیر فانی وقت کے مالک ہو، تمہارے وقت کا شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ دن رات گذرتے جاتے ہیں اور زمانہ پھولوں کی طرح کھلتا اور مرجھاتا جاتا ہے، لیکن تم قائم رہتے ہو، چھوٹے سے جنگلی پھول کی طرح صدیاں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی !

بالِ جبریل

ب : فضول ہی برباد کرنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے اور وقت کی غریبی کی وجہ سے ہمیں موقعہ حاصل کرنے کے لئے چھینا جھپٹی کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح سے جھگڑنے والے آدمیوں کے درمیان میرا وقت گذر جاتا ہے۔ اور کچھ بھی تمہارے حضور میں نذرانہ پیش نہیں کر سکتا ہوں۔

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

بالِ جبریل

اقبالؒ کے فہم و ادراک نے انسانی رفتارِ تجسس پر تازیانہ کا کام کیا ہے۔ ہمارا شاعر کہتا ہے کہ انسان کو دنیاوی الجھیڑوں میں ہی وقت ضائع نہ کر دینا چاہیئے کبھی خود کو پہچاننے کی بھی کوشش کرنی لازم ہے کیونکہ اسی پیکرِ خاکی میں نورِ غیر فانی درخشاں و تابندہ ہے۔

ج : دن بیت جانے پر میں تیز رفتاری سے تمہاری طرف بھاگتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے دروازے بند ہو جائیں، لیکن پھر بھی سمجھتا ہوں کہ ابھی بھی وقت باقی ہے۔

تو مردِ میداں، تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی !
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

بالِ جبریل

۸۳۔ الف : ماں! تمہاری خاطر میں اپنے دکھ بھرے
آنسوؤں کی مالا بناؤں گا۔

ب : ستاروں نے تمہارے پاؤں کی زیبائش
کے لئے پازیب بنائی ہے، لیکن میرا یہ
ہار تمہارے سینے پر خوشنما معلوم ہوگا۔

ج : دولت اور شہرت تمہیں سے حاصل ہوتی
ہے اور ان کا دینا یا نہ دینا تمہارے
ہی اختیار میں ہے۔ لیکن یہ دکھ تو میرا
ہی ہے۔ جب میں اسے تمہاری نذر کرتا
ہوں، تب میں تمہاری شفقت پاتا ہوں

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
بانگ

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آبِ آورد سے معمور ہے دامن مرا
بانگِ

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
بانگِ درا

۸۴۔ الف: یہ خلشِ جدائی ہی تو ہے جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، اور اس غیر فانی آسمان پر طرح طرح کے بھیس بدلتی ہے۔

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا،
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

بانگِ درا

ب: خلشِ جدائی میں ہی تو ستارے ٹمٹماتے ہیں اور ساون کے برستے ہوئے اندھیرے میں بے چین و مضطرب رہتے ہیں۔

سکوں ناآشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے!
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آبیٹھی ہے پارے میں؟

بانگِ درا

ج: یہ جدائی ہی تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے جو آبادیوں میں محبت، وصال اور غم و مسرت کو پھیلاتی ہے اور میرے شاعرانہ دل میں نغموں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام
بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام
سکوتِ شامِ جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

بانگِ درا

۸۵۔ الف: جس وقت بہادر سپاہی پہلے پہل اپنے مالک کے گھر سے نکلے تو انہوں نے اپنے ہتھیار اور زرہ بکتر کہاں چھپا رکھے تھے؟

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
بانگِ درا

ٹیگور کے نزدیک ایک سپاہی کے متعلق بس یہی تصوّر ہے کہ اُس کا جسم جنگی ہتھیاروں سے سجا ہُوا ہو حالانکہ مردِ مومن بشرطیکہ اسکے قلب و دماغ میں عشق بیدار ہو بے شمشیر بھی لڑتا ہے اور فاتح کہلاتا ہے۔

ب: جس دن پہلے پہل باہر آئے اُس دن تیروں کی بارش میں وہ بالکل ناتوان اور بے کس معلوم ہوتے تھے، جب وہ سپاہی پھر اپنے مالک کے گھر لوٹے تو انہوں نے اپنی مردانہ طاقت کو کہاں چھُپا دیا تھا؟

تجھ سے سرکش ہُوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
بانگِ درا

ج: انہوں نے اپنی تلوار پھینک دی تھی اور ہتھیار وغیرہ ڈال دئے تھے۔ ان کی پیشانی پر امن نمودار تھا اور انہوں نے ثمرِ حیات کی تمنّا کو ترک کر دیا تھا۔

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
بانگِ درا

۸۶ - الف : تمہارا فرشتہ ملک الموت میرے دروازے پر آیا
اور نامعلوم سمندروں کو پار کر کے تمہارا پیغام
لایا ہے، رات اندھیری ہے، اور دل خوفزدہ
ہے، لیکن پھر بھی چراغ روشن کر کے دروازہ
کھولوں گا اور اس کا استقبال کروں گا کہ تمہارا
پیامی جو ٹھہرا۔

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی!
تو اے مسافرِ شب! خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی!
بالِ جبریل

موت سے اور تاریکیٔ شب سے محض ایک غیر مسلم ہی خوفزدہ ہو سکتا ہے، جسے حقیقتِ موت سے آگاہی نہیں اور شبِ وجود کو بیرونی تاریکی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا مومن تو ہر وقت موت کی آغوش میں کھیلتا رہتا ہے۔

ب : ہاتھ جوڑ کر بھیگی آنکھوں سے اُس کی پرستش
کروں گا اور اسکے قدموں میں اپنی دولتِ
قلب نچھاور کروں گا۔

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جنکی ستاروں کو عرقناک
بالِ جبریل

مردِ مومن کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطروں کی یہ قدر و منزلت ہے کہ ستارے ندامت میں ڈوب جاتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے حضور میں ستاروں سے کہیں زیادہ یہ قطرے قیمتی اور محبوب ہیں، انہیں ملک الموت کی ہمدردی خریدنے کیلئے پیش کیا جائے یہ انسان کی کمزوری ہے اور کچھ نہیں۔

ج : میرے جسم پر تاریکی کا پردہ ڈال دو، وہ اپنا
کام ختم کر لے گا اور چلا جائے گا۔ سنسان مکان
میں تمہاری آخری نذر کے لئے میری یہ بے آسرا
روح ہی صرف باقی رہ جائے گی۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
ارمغانِ حجاز

۷۰- الف: ایک دم نا امیدوں میں ہی اُسے مَیں اپنے گھر کے گوشے گوشے میں تلاش کرتا ہوں لیکن ملتا ہی نہیں میرا گھر بالکل چھوٹا سا ہے لیکن جو کچھ بھی ایک بار اس میں سے چلا جاتا ہے پھر واپس نہیں لوٹتا۔

نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھکو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی
ضربِ کلیم

بندے کو اپنے محبوب معبود کی تلاش ہو اور وہ اپنے اندر گوشے گوشے میں تلاش کر کے مایوس ہو کر بیٹھ جائے، یہی کور نگاہی نہیں تو کیا ہے؟

ب: لیکن میرے مالک! تمہارا محل تو بڑا وسیع ہے اسکی تلاش میں مَیں تمہارے دروازے پر آیا ہوں بوقت شام آسمان کی سبز چھت کے سائے کے نیچے کھڑا کھڑا حیرت سے تمہیں تکتا رہتا ہوں۔

دریا میں موتی اے موجِ بیباک
ساحل کی سوغات، خار و خس و خاشاک!
ضربِ کلیم

ہمارے شاعر کا پیغام ہے کہ اگر انسان کو اپنے معبود یا منزلِ اعظم کی تلاش ہے تو اسے اپنے اندر تلاش کرے کیونکہ سب کچھ یہیں موجود ہے باہر کچھ نہیں ہے۔

ج: مَیں اندازِ غیر فانی کی اس حد پر آگیا ہوں جہاں سے امید، مسرت اور چشمِ آبدیدہ سے دیکھا ہوا کوئی بھی نظارہ کبھی بھی غائب نہیں ہو سکتا۔

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں!
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی!
ضربِ کلیم

د: آہ! ڈبو دو میری اس حیاتِ پریشان کو اس بحرِ عمیق میں اختتام کی اس لا انتہائی گہرائی میں جہاں کہ اختتام میں کھوئے ہوئے اس میٹھے چھونے کا ایکبار پھر سے مزہ اے خدا اٹھا لینے دو

تُو ہے محیطِ بیکراں میں ہُوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر
بالِ جبریل

۸۸۔ (الف): اے غیر فانی مندر کے دیوتا! بنسیا کے ٹوٹے ہوئے تار اب تمہارا گیت نہیں گاتے۔ شام کی گھنٹیاں اب تمہاری آرتی کے وقت کی پکار نہیں کرتیں، ہوا میں بھی سکوت ہے۔

نا چیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالم مجبور ہے تو عالمِ آزاد

ضربِ کلیم

ہمارے شاعر کا تخیل کس قدر بلند ہے؛ وہ انسان سے مخاطب ہے کہ یہ مادی دنیا تمام تر مجبور و محکوم ہے لیکن تو تمام بندشوں سے آزاد بلکہ اس دنیا، مادی دنیا کا حاکم اور شہنشاہِ اعظم ہے لیکن ٹیگور سارنگی کے تاروں مندر کی گھنٹیوں اور ہوا کے سکوت ہی میں کھو گیا ہے، گویا اسکی کائنات ان چیزوں کے سہارے تھی، جو ان کے خاموش ہو جانے سے وہ بھی خاموش ہو گئی ہے۔

ب: تمہارے ویران مندر میں بسنت کی مست ہوائیں اٹکھیلیاں کرتی ہیں اور ان پھولوں کا پیغام لاتی ہیں جو اب تمہاری نذر نہیں کئے جاتے۔

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیئے؟

ضربِ کلیم

بندۂ آزاد بقولِ اقبالؒ ان ظاہری مناظر کی تمام طاقتوں کو صرف اللہ ہی کے اختیار میں دیکھتا ہے اور ان تمام کو اپنے مصرف کے لئے پاتا ہے۔ لیکن ٹیگور ان چیزوں سے اس قدر متاثر نظر آتا ہے گویا یہ مادہ چیزیں اسکی حاکم ہیں اور وہ محکوم!

ج: تمہارا وہی پرانا پجاری ابھی تک تمہاری نگاہِ محبت کے لئے بھٹکتا پھر رہا ہے۔ شام کے وقت جب دھوپ اور چھاؤں دھندلکے میں غائب ہو جاتی ہیں تب وہ دلِ ناکام سے مایوس ہو کر شکستہ مندر میں لوٹ آتا ہے۔

جس بندۂ حق کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق
اس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق

ضربِ کلیم

ٹیگور آفتاب کی روشنی میں جلوۂ حقیقی کی تلاش کرتا رہا لیکن نہ کر سکا، دن بھر مناظرِ فطرت میں عکسِ معبود دیکھنے کی سعیٔ ناتمام بھی کی لیکن بے سود۔ اور شام کی تاریکیوں سے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ح: اے دیوتا! کتنے ہی تہوار آتے ہیں، لیکن چپ چاپ بنا دھوم دھام ہی چلے جاتے ہیں۔ کتنی ہی عبادت کی راتیں بغیر چراغ جلائے ہی ختم ہو کر گذر جاتی ہیں۔

ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سُراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

ضربِ کلیم

ل: ماہرِ فنِ بت تراش ہزاروں نئی مورتیاں بناتے ہیں جو اچھے وقت پر مقدس روایات کی پاکیزہ دھار میں بہا دی جاتی ہیں۔ صرف ویران مندر کا دیوتا ہی نظر انداز ہو کر اس گانے بجانے سے محروم رہ جاتا ہے۔

سینے میں اگر نہ ہو دلِ گرم
رہ جاتی ہے زندگی میں خامی

ضربِ کلیم

۴۹۔ الف: میرے مالک کی بھی اب یہی خواہش ہے کہ میں بلند آواز میں اسے پکارنا بند کر دوں آج سے دھیمی آواز میں ہی اسکی عبادت کیا کروں گا۔ میرے دل کے بول گیتوں کے میٹھے سروں کی گنگناہٹ میں ہی اس تک پہنچ جائیں گے

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک!
ضربِ کلیم

ہمارے شاعرِ فطرت نگار کے نزدیک عبادت میں آواز یا لے کی قید لازمی نہیں ہے بلکہ صرف انسان کا اندرون گرمئ عشقِ معبود سے آتشناک ہونا چاہیئے لیکن ٹیگور اسی پیچ و خم میں الجھا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے نزدیک آواز کا دھیما پن خدا کو زیادہ محبوب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نرم کلامی مناسب اور موزوں ہے لیکن یہ شے عبادت کا جزوِ عظیم نہیں ہے۔

ج: لوگ شاہی منڈیوں میں بھاگے جا رہے ہیں، خرید و فروخت کرنے والے بھی وہاں موجود ہیں لیکن میں نے تو کام کی زیادتی اور دوپہر کے اس بے وقت وقت میں ہی کام سے چھٹی لے لی ہے۔

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد
ضربِ کلیم

ٹیگور اگرچہ جانتا ہے کہ صحیح کام کا وقت جوانی کا زمانہ ہی ہے، لیکن باوجود اس کے وہ راہبانہ زندگی کی تقلید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر اقبالؒ محنتِ پیہم کی تعلیم دیتا ہے، اسکے نزدیک آرام حرام ہے، زندگی کا مقصد طوفانوں سے کھیلنا ہے، تھپیڑوں سے لڑنا ہے، منجمد سلوں کی طرح جم کر بیٹھ رہنا نہیں ہے۔

ج : تب ابھی ہی میرا باغیچہ پھولوں سے لد جانے دو
اور اس دوپہر میں ہی شہد کی مکھیوں کو دھیمی
شیریں گنجار کرنے دو۔

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تابناک نہیں

ضربِ کلیم

ح : یہ اچھا ہے یا بُرا ہے اس جھگڑے میں میں نے
بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے، لیکن اب باقی
دنوں کے لئے میرے دوست کی یہی خواہش ہے
کہ میرا دل اسکی طرف ہی لگ جائے۔ میں سمجھ
نہیں پاتا ہوں کہ بے سبب اس اچانک بلاوے
کا کیا مطلب ہے ؟

جس روز دل کی رمزِ مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

ضربِ کلیم

اس میں کلام نہیں ہے کہ انسان کی رہنمائی انسان کا ضمیر کرتا رہتا
ہے لیکن انسان اسکی آواز کو سمجھ نہیں پاتا اور وہ تھک کر خاموش ہو جاتا ہے،
یہی وہ آواز ہے جسے صدائے ناقہ جرس کہہ سکتے ہیں جس کے سہارے
قافلہ کا قافلہ اپنی صحیح منزل تک پہنچتا ہے ٹیگور بیچارہ بھی نوائے
ضمیر کو سمجھنے سے قاصر ہے اور ہمارا شاعر کہتا ہے کہ جس روز
انسان یہ آواز (رمز) سمجھ گیا بس اسی روز سے مشکلاتِ زندگی کے
مراحل آسان ہونے شروع ہو جائیں گے۔

۹۰۔ الف: جب موت تمہارے دروازے پر آجائے گی تو اُس دن اسے تم کیا نذر کروگے؟

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اسکو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

ارمغانِ حجاز

ب: آہا! اس لبریز گاگرِ حیات کو میں اپنے مہمان کی خدمت میں پیش کروں گا، خالی ہاتھ اسے کبھی بھی جانے نہیں دُوں گا۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی!
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

بانگِ درا

ج: اپنے آخری لمحوں میں اُس دن جب موت میرے دروازے پر آئے گی، موسمِ خزاں اور بسنت سے اکٹھا کیا ہوا شہد اور زندگی بھر میں جمع کئے ہوئے مال و دولت کو اسکی نذر کردوں گا۔

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

ارمغانِ حجاز

فلسفۂ موت و حیات جسے پھر صدیوں کے بعد علامہ اقبالؒ نے ایک صحیح نظریہ کے ماتحت دنیا کے سامنے پیش کیا اس میں مرزا غالبؒ بھی ٹھوکر کھا گئے ہیں اور موت کے نقابِ شام کو اُلٹ کر صبحِ حیات کی جھلک دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی اور سطحی مطالعہ کے بعد کہہ دیا کہ ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

ٹیگور بھی اس پریشانیٔ عناصر کو فنائے ابدی تصوّر فرما رہے ہیں لیکن اقبالؒ نے اس تبدیلیٔ مقام کا نام صبحِ دوام رکھا ہے ان کے نزدیک یہ چیز صرف ایک انتقالِ مقام ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ ہے بھی ٹھیک کہ موت رُوح پر حرام ہے۔

۹۱- (الف): اے موت! تو ہی میری زندگی کی آخری ہچکی ہے "آؤ" اور مجھ سے دھیرے دھیرے بولو تو ہر روز میں نے تمہاری راہ دیکھی ہے زندگی کے سب دکھ سکھ میں نے تمہاری ہی خاطر اٹھائے ہیں۔

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

بانگِ درا

(ب): جو کچھ بھی میں ہوں، جو کچھ بھی میرے پاس ہے اور جو کچھ بھی میرا اعتقاد اور عشق ہے وہ سب چپکے چپکے تمہاری ہی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ صرف تمہاری آخری نگاہِ کرم ہوتے ہی یہ میری تمام زندگی ہمیشہ کے لئے تمہاری ہی ہو جائے گی۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

بالِ جبریل

(ج): پھولوں کی مالا میں پھول سب پرو دیئے گئے ہیں، اور مالا دولہا کے گلے میں پڑنے کا انتظار کر رہی ہے۔ شادی کے بعد دلہن اپنا گھر بار چھوڑ رات کے گہرے عالمِ تنہائی میں اپنے شوہر کی چہیتی بنے گی۔

سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو
نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی

ارمغانِ حجاز

ٹیگور کی نگاہ اکثر مسئلۂ آواگون میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور جو اس سے الگ ہوئی تو فنا کے غلط مفہوم سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی، اس نے جسم کے خاتمہ کو ہی انسان کا مقامِ اختتام سمجھ لیا، حالانکہ روح کو جسم سے کچھ بھی تو تعلق نہیں، روح الگ ہو جاتی ہے اور جسم کے اجزاء اپنی اصل میں مل جاتے ہیں اور روح عالمِ ارواح میں پہنچ کر ابدی زندگی اختیار کر لیتی ہے۔

۹۲۔ الف: میں جانتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جب یہ سارا عالم میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا اور میری زندگی میری آنکھوں پر آخری پردہ ڈال کر چپ چاپ ختم ہو جائے گی۔

زندگی کی یہ آگ کا انجام خاکستر نہیں!
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

بانگِ درا

ب: لیکن اس وقت بھی ستارے رات میں جھم جھم کرتے ہوئے جاگتے رہیں گے اور اسی طرح سحر ہو گی، اور (دریا کی موجوں کی طرح وقت بھی دکھ سکھ پیدا کرتا رہے گا۔)

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آگئی میسر مری شوخیٔ نظارا

ضربِ کلیم

ج: جب میں اپنی زندگی کے ان آخری لمحوں پر سوچ بچار کرتا ہوں، تب وقت کی حد ٹوٹ جاتی ہے، اور میں موت کے پاس ہی اس جہان کو دیکھ پاتا ہوں جہاں بے نیاز خزانہ جو یونہی بکھرا پڑا رہتا ہے، اور جہاں نیچ سے نیچ مرتبہ ملنا بھی مشکل ہے اور نیچ زندگی بھی نایاب ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق!
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

د: وہ چیزیں جن کی میں فضول ہی خواہش کرتا ہوں، اور وہ چیزیں جو میں نے حاصل کر لی ہیں وہ سب مجھے نہیں چاہئیں، اب تو صرف انہیں چیزوں کو حاصل کرنے کی خواہش ہے جنہیں میں نے ہمیشہ ٹھکرایا ہے

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا؟

۹۳۔ الف: اس دنیا میں مجھے اب چھٹی مل گئی ہے۔ میرے بھائیو مجھے رخصت دو! آپ سب کو میں سلام کرتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں

چھوڑ کر مانندِ بو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں!

بانگِ درا

ب: یہ لو میرے گھر بار کی کنجیاں، انہیں میں واپس کرتا ہوں اور اس گھر کے تمام حقوق سے کنارہ کشی کرتا ہوں۔ میں تو صرف تم سے ان آخری لمحوں میں تسکین اور محبت بھرے الفاظ کا خواہش مند ہوں۔

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

بانگِ درا

ج: ہم بہت وقت تک ایک دوسرے کے پڑوسی رہے، لیکن میں اتنا دے نہ سکا جتنا میں نے پایا، اب سحر نمودار ہوتی ہے، اور وہ چراغ جو میری اندھیری کٹیا کو روشن کر رہا تھا، بجھ گیا ہے۔ میرا بلاوا آگیا ہے، اور میں لمبے سفر کے لئے تیار ہوں۔

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

بانگِ درا

۹۴۔ الف: میرے دوستو! میرے بھائیو! اب میرے جانے سفر کا وقت ہے، آپ لوگ میرے حق میں دعا مانگو آسمان صبح کی لالی سے منور ہو گیا ہے اور میرا راستہ خوشنما ہو گیا ہے۔

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی!
کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا
دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

ارمغانِ حجاز

ب: یہ مت پوچھیے کہ وہاں میں اپنے ساتھ کیا کچھ لیے جا رہا ہوں میں تو خالی ہی خالی، لیکن دل میں امید لے کر چل پڑا اور مجھے امید ہے کہ میرا وطن چمن ہو گا۔

ہمنشیں نرگسِ شہلا رفیقِ گل ہوں میں!
ہے چمن میرا وطن ہمسایۂ بلبل ہوں میں

بانگِ درا

ج: میں ورمالا پہن کر کوچ کروں گا، اور مسافروں کی طرح گیروا لباس پہن لوں گا۔ اگرچہ راستہ خطرناک ہے، لیکن میرے دل میں ذرا سا بھی خطرہ نہیں ہے۔

آغوش میں میری وہ تجلّی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیّار

بالِ جبریل

د: جب میرا سفر ختم ہو گا تو شام کا ستارہ نمودار ہو گا اور ستا ہی راستے پر شام کے گیت کے نغمے گونج اٹھیں گے۔ اور ہر صبح میں فرشِ سبزہ سے اٹھوں گا۔

شام کو آوازِ چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے

بانگِ درا

۹۵۔ الف: مجھے اس وقت کا کچھ بھی خیال نہیں کہ جب میں نے پہلے پہل اس زندگی میں قدم رکھا تھا، کونسی وہ طاقت تھی کہ جس نے مجھے جنگل میں آدھی رات میں کھِل جانے والی کلی کی طرح اس عالمِ راز داد میں منکشف کیا۔

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اُٹھا شرارِ آرزو
زندگانی ہے تری آزادِ قیدِ امتیاز
تیری آنکھوں پہ ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

بانگِ درا

ب: سویرے ہی جب میں نے روشنی کو دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میں اس دنیا سے ناواقف نہیں ہُوں، اس نامعلوم اور بے وجود طاقت نے میری ماں کا رُوپ لے کر مجھے اپنی گود میں لٹا لیا ہے۔

تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے!
وسعتِ آغوشِ مادر اک جہاں میرے لئے

بانگِ درا

ج: موت کے وقت بھی وہی نامعلوم طاقت احبابِ دیرینہ کی طرح ظہور پذیر ہوگی، مجھے یہ زندگی محبوب تھی، اسلئے موت بھی مجھے محبوب ہوگی۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بالِ جبریل

د: جب ماں بچے کو دائیں پستان سے الگ کرتی ہے تو بچہ رونے لگتا ہے۔ لیکن فوراً ہی جب وہ بائیں پستان سے دُودھ پلانے لگتی ہے تو وہ چُپ ہو جاتا ہے

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے فقط عالمِ معنی کا ظہور

ضربِ کلیم

۹۱ الف: جب میں یہاں سے وہاں کا لمبا سفر کروں تو میرے آخری لفظ یہی ہوں کہ جو میں نے دیکھا ہے عجوبہ ہے

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاجِ مہر و ماہ نہیں

ضربِ کلیم

ٹیگور عالمِ رنگ و بُو کے مطالعہ کو محض عجوبہ کے لفظ سے تعبیر کر سکا، اس کی نگاہ ان ظاہر بینیوں سے آگے نہ گذر سکی۔

ب: روشنی کے سمندر میں لہراتے ہوئے اس کنول کے پوشیدہ شہد کو میں نے چکھا ہے اور میں مُکت ہو گیا ہوں۔ یہی میرے آخری لفظ ہوں۔

اسی سرود میں پوشیدہ موت ہے تیری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

ضربِ کلیم

ٹیگور جس شے کو مکتی یا نجات تصور کرتا ہے، وہی اس کی موت ہے جس کا اسے علم نہیں ہے کیونکہ اس کا اندرون تپشِ وحدت سے سرگرمِ عشق و مستی نہیں ہے۔

ج: ہزاروں طرح کی کھیلوں کے اس میدان میں میں نے خوب کھیل کھیلے ہیں اور یہیں بے وجود کے جلوے پائے ہیں۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں وجود اپنا
کہ ذرّہ ذرّہ میں ہے ذوقِ آشکارائی!

ضربِ کلیم

علامہ اقبالؒ کے نظریہ کے مطابق ہر ذرّے میں نورِ خدا جلوہ افروز ہونے کے باوجود یکتائیِ فطرت کا اصول اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے لیکن ٹیگور کے نزدیک یہی ہجومِ جلوہ عبادتِ غیر اللہ اور بت پرستی کی بنیاد حاصل ہو جاتی ہے۔

د: میرا تمام جسم اسکے چھونے سے جو خود چھونے سے دور ہے تھرا اٹھا ہے اور اگر یہی اس وقت میرا آخر ہے تو میں اس کا استقبال کرتا ہوں، یہی میرے آخری لفظ ہوں۔

اُن کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
رُوح ہے جس کی دمِ پرواز سرتاپا نظر

ضربِ کلیم

۹۷۔ الف: میں اور تم جب اکٹھے ہی کھیلا کرتے تھے، تب میں نے تم سے کبھی بھی یہ نہ پوچھا کہ تم کون ہو؟ اُس وقت میرا زمانہ کھیل میں محو تھا، مجھ میں حجاب یا ڈر ذرا سا بھی نہ تھا، سویرے تڑکے ہی تم مجھے اپنے پیارے ساتھی کی طرح نیند سے جگاتے تھے اور پھر اپنے ساتھ جنگلوں میں اور وادیوں میں گھماتے تھے۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی!

ضربِ کلیم

ب: ان دنوں میں نے کبھی بھی ان گیتوں کا راز سمجھنے کی کوشش نہ کی جو تم مجھے سناتے تھے، میں صرف گنگنانے میں ہی مزہ لیتا تھا اور اب جب کھیل کا وقت گزر گیا ہے تو اچانک ہی میں دیکھتا ہوں کہ کل کائنات اپنے تمام خاموش ستاروں کے ساتھ تمہارے قدموں میں آنکھیں جھکائے کھڑی ہے۔

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود
غمیں نہ ہو کہ بہت دُور ہے ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود

ضربِ کلیم

مان لیا کہ انسان کا بچپن ذوقِ تجسّس اور فکرِ تحقیق سے بے نیاز و بے خیال ہوتا ہے، اس وقت دیدۂ بینا میں قوّتِ امتیاز نہیں ہوتی۔ خرد ناپختہ اور قلب غیر سلیم ہوتا ہے، لیکن ٹیگور تو عمر کے آخری حصّے میں بھی خام نظر آرہا ہے، وہی کج ادائی، وہی کج نگاہی اور وہی بے شعوری اس کے رگ و پے میں کارفرما ہے۔

۸۹۔الف: اپنی شکست کی مالاؤں اور انعامات سے میں تمہارا استقبال کروں گا۔ شکست ہوئے بغیر ہی تم سے بچ نکلنا میری ہمت سے بعید ہے۔

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اسکی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطون!

ضربِ کلیم

ب: مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا غرور چور چورا ہو جائے گا۔ میری زندگی بے حد تکلیف میں اپنے سب بندھن توڑ دے گی اور میرا ویران دل کھوکھلی بنسری کی طرح درد بھرے گیت گائے گا۔ جیسے سنگ پتھر بھی پگھل جائیں گے۔

عناصر اسکے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ درُوں

ضربِ کلیم

ج: مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کنول کی سینکڑوں پنکھڑیاں ہمیشہ ہی بند نہ رہیں گی اور ایک نہ ایک دن شہد کے پوشیدہ دروازے کھل جائیں گے

جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جسکی
اُسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجُود

ضربِ کلیم

ح: نیلے آسمان سے کوئی میری طرف دیکھے گا۔ اور چپ چاپ مجھے بلائے گا، میں سب بندھنوں سے چھوٹ جاؤں گا اور تمہارے قدموں میں موت کو حاصل کروں گا۔

پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جا
چھوڑ چمنستان و بیابان و در و بام

ضربِ کلیم

۹۹۔ الف: کشتیِ حیات کے بادبان کو جب میں چھوڑ کر بیٹھ
جاتا ہوں اور مجھے یقین ہوتا ہے کہ تم اسے اسی
وقت سنبھال لوگے جو کچھ ہونا چاہیئے وہ خود بخود ہو
جائے گا، اس کے لئے کوشش کرنا فضول ہی ہے

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

ضربِ کلیم

نظریِ تقدیر پر قناعت، مردِ باہمت کو زیبا نہیں ہے، کمی اور کمزور قوتیں ہی اس کا سہارا لیتی ہیں۔ صاحبِ قوت کے لئے تو آسمان کی بلندیاں بھی کچھ دور نہیں ہیں۔

ب: اے دل! تب کھینچ لے اپنے ہاتھ اور چپ چاپ ہار
مان کر جس حالت میں ہے اسی میں اپنی بہبودی سمجھ۔ میرے
یہ چھوٹے چھوٹے چراغ ہوا کے ہر ایک ہلکے سے جھونکے
میں ہی بجھ جاتے ہیں اور انہیں بار بار جلانے کی
کوشش میں ہی سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کیلئے لازم ہے تگ و دو

ضربِ کلیم

اپنے ذوقِ اندروں کو تعلیمِ شکست دینا ہر مردِ دانا اور صاحبِ حکمت کے نزدیک خامیِ عقل و دانش کا ثبوت ہے کیونکہ طالبِ عروج سراپا محوِ تگ و دو رہا کرتے ہیں اور کسی مقام پر بھی تصورِ شکست ان کے ذہن میں نہیں آیا کرتا اور آئے بھی تو وہ اسے جگہ نہیں دیتے۔

ج: لیکن اس مرتبہ میں عقلمندی سے کام لوں گا۔
اندھیرے میں ہی زمین پر آسن بچھا کر تمہارا انتظار
کروں گا، خدایا! جب کبھی تم خوش ہو تو چپکے سے
آنا اور آسن پر بیٹھ جانا۔

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر

ضربِ کلیم

۱۰۰۔ الف: اِس وجود چیزوں کے سمندر میں مکمل بے وجود موتی کو پانے کے لئے میں فضول ہی غوطے لگاتا رہا ہوں۔ موسموں کے اثر سے اپنی بوسیدہ کشتی میں بیٹھ کر ساحل تا ساحل نہ ٹھہروں گا۔ وہ دن گذر گئے جب لہروں پر تھپیڑے کھانے میں مزہ لیتا تھا، اب تو میں حیاتِ غیر فانی میں جذب ہو جانے کا خواہشمند ہوں۔

؎ ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا!
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا

؎ یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

ضربِ کلیم

ب: میں اپنے اس سازِ حیات کو بحرِ بیکراں کی اس محفلِ عوام میں لے جاؤں گا، جہاں بے آواز تاروں سے نغمے نکلتے ہیں۔

؎ میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کیلئے جہاں میں فراغ

ضربِ کلیم

ج: روزمرہ کے سُروں میں اپنے سازِ حیات کے نغموں کی مشق کروں گا اور جب یہ آخری نغمہ نکال چکے گی تو اسے انتہائی خاموشی کی نذر کروں گا۔

؎ سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

ضربِ کلیم

ٹیگور کے نزدیک دمِ واپسیں کی آخری ہچکی کے بعد عالمِ سکون و اطمینان میں قدم رکھنا ہے، حالانکہ فلسفۂ موت صرف تغیرِ مقام کا نام ہے۔ ٹیگور عملی زندگی کی مسلسل تگ و دو سے اکتایا ہوا نظر آتا ہے اور یہی چیز انسانوں کی موت اور قوموں کے زوال کا آئینہ ہے۔

۱۰۱- الف: یہ اپنے گیت میں نے ہمیشہ تمہاری ہی تلاش میں گائے ہیں۔ ان کو گاتا گاتا ہی میں تمہاری تلاش میں دربدر بھٹکتا پھرا ہوں اور ان گیتوں نے ہی مجھے دنیا کا تجربہ عطا فرمایا ہے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن!
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

ضربِ کلیم

ب: میں نے جو کچھ بھی آجتک جانا ہے وہ سب میرے گیتوں نے ہی مجھے سکھایا ہے بہت سے پوشیدہ راز ان کے ذریعہ سے ہی سمجھ پایا ہوں اور انہی کے ذریعے میرے دل میں نئے نئے خیال پیدا ہوتے رہے ہیں۔

ہے شعر ترا اگرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے؟
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

ضربِ کلیم

ج: سکھ اور دکھ کے اس جہان میں گیتوں نے ہمیشہ ہی میری راہنمائی کی ہے لیکن اب میرے سفر کے اس آخری لمحے میں نہ جانے یہ مجھے کس شاہی دروازہ پہ لے آئے ہیں؟

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

ضربِ کلیم

۱۰۲۔ الف: لوگوں کے ہجوم میں غرور سے کہا کرتا تھا کہ میں تمہیں سمجھ پایا ہوں، جان پایا ہوں، لوگ میرے سب کاموں میں تمہارا عکس سمجھتے ہیں وہ آ کر مجھ سے پوچھتے ہیں وہ کون ہے؟ مجھ سے جواب دئے نہیں بنتا ہے، میں کہتا ہوں مجھے تو پتہ نہیں، یہ سنکر مجھے الزام دیتے ہوئے اور حقیر سمجھ کر چلے جاتے ہیں اور تم وہیں بیٹھے ہوئے مسکراتے رہتے ہو۔

ب: میں تمہاری کہانیاں اپنے غیر فانی گیتوں میں بھر دیتا ہوں، پوشیدہ راز میرے دل سے پھوٹ نکلتے ہیں وہ آتے ہیں اور کہتے ہیں: تمہارے گیتوں کے کیا معنی ہیں؟ میں کیا جواب دوں انہیں؟ میں کہتا ہوں اسکے معنی کون سمجھ سکتا ہے، وہ منہ لبسور کر چلے جاتے ہیں، تم وہاں بیٹھے بیٹھے مسکراتے رہتے ہو۔

تو زندگی ہے، پائندگی ہے
باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی

میری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

بالِ جبریل

نہ معلوم ٹیگور میں وہ جرأت کیوں نہیں ہے جو ہمارے شاعرِ مشرق علامہ اقبال میں موجود ہے کہ وہ سوال کرنے والوں کو ایسا منہ توڑ جواب دیتے ہیں کہ قلب و خرد مطیع ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ٹیگور اس معاملہ میں ناکام نظر آتا ہے شاید اس لئے کہ اسکے گیتوں میں وہ شے نہیں ہے جو سائل کو مطمئن کر سکے۔

۱۔ الف: میرے خدا میرا ہر اعضائے جسم یکتا ہو کر تمہیں سلام کرتا ہے۔ اے مالک! یہ جسم تمہارے چرنوں میں ٹھہر کر دنیا بھر کو پا جائے۔ جس طرح برسے ساون کے پانی بھرے بادل نیچے جھک آتے ہیں اسی طرح میرا مکمل دل یکتا ہو کر تمہیں سلام کرے۔

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں
شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی
ضربِ کلیم

ٹیگور عمر بھر کے ملاحظہ و مشاہدات کے بعد بھی خدا کے ظہور کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکا اور دعا گو ہے کہ اسے نیاز حاصل ہو جائیں۔ اور اس کا دل دنیا سے چشم پوشی کر کے سراپا محوِ یادِ الٰہی ہو کر رہ جائے۔ لیکن اقبالؒ کا پیغام ہے کہ بقائے دوام بھی اسی جہان میں ہے۔ بشرطیکہ انسان اس کا طلبگار ہو۔

ب: میرے سارے گیت اپنی طرح طرح کی راگنیوں کے ساتھ ایک ہی آبشار میں جذب ہو کر بحرِ خاموش کی طرف روانہ ہو جائیں، اور مجھے مکتی مل جائے۔

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن
ضربِ کلیم

بحرِ خاموش سے مراد موت ہے اور ٹیگور موت کی خاموشی کو مکتی یا نجات کا حاصل سمجھتا ہے اور یہی اس کی کج نگاہی کی دلیل ہے۔ حالانکہ موت کی خاموشی ایک آواز کی علمبردار ہے اور اسے وہی سن سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے جو خودی سے واقف ہو۔

جو خیالِ آشیاں میں مضطرب ہنس کی طرح جو رات دن اُڑ کر پہاڑی نشیمن میں چلے جاتے ہیں، میرے پران بھی یکجا ہو کر تمہیں سلام کر کے اپنے مقامِ لامکاں کے سفر کو کوچ کریں تا کہ میں مِٹ کر تیرا راز پا سکوں، اور یہ کشمکشِ حیات ختم ہو جائے۔

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہُوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا!

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

ضربِ کلیم

جو شخص کشمکشِ حیات سے گھبرا کر موت کی خاموشیوں کو آواز دے اور زندگی میں پروردگارِ عالم کا راز نہ پا سکے اور عمر بھر اندھیرے میں بھٹکتا رہے، اُسے مدبّر صاحبِ دل، صاحبِ نظر اور اہلِ علم و دانش کہہ سکیں گے؟ اگر نہیں تو ٹیگور کی کتاب

گیتا انجلی

کو سامنے رکھ کر ٹیگور کے متعلق خود ہی فیصلہ فرما لیجئے۔

ہماری خاص مطبوعات

